

اڑان

صابر ظفر

اُڑان

صابر ظفر

دانیال

صابر ظفر کے مطبوعہ شعری مجموعے

ابتدا
دُھواں اور پھول
پاتال
جتنی آنکھیں اچھی ہوں گی
دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے
لہو ترنگ
دُکھوں کی چادر
بارہ دری میں شام
عشق میں روگ ہزار
اک تری یاد رہ گئی باقی
بے آہٹ چلی آتی ہے موت
صابر ظفر کی مزاحمتی شاعری
چین اِک پل نہیں
اُڑان

سرورق :۔ جمیل نقش

انتخاب : انصاری

بارِ اوّل :۔ بک

جمیل حقوق بحق ... بون کے نام محفوظ

طابع :۔ مقصو پرنٹرز

ناشر :۔ حوری نورانی

مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبرز 2 عبداللہ ہارون روڈ۔ کراچی

قیمت :۔ دو سو روپے

طاہر نظامی کے نام

صابر ظفر کا رنگِ غزل

شاعری کے سلسلے میں بعض سوالات بار بار زیرِ بحث آتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حقیقی معنوں میں شاعر کون ہے اور ناشاعر کون؟ شاعری اور غیر شاعری میں کیا فرق ہے؟ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو ہر شخص ان سوالات کا جواب اپنے انداز میں دینے کی کوشش کرتا ہے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ اُسے سچائی اور حقیقی عظمت کی بڑی تلاش ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثریت نے لکھنے کا کام سنبھال تو لیا ہے مستند تحریروں کے مطالعے سے مستقل گریز کو اپنا ادبی شعار بھی بنالیا ہے۔ پھر قدیم مفکرین تو نام بھی نہیں لیتے کہ ساختیات اور مابعد جدیدیت کی فیشن ایبل دنیا میں اُنھیں فرسودہ اور ازکاررفتہ نہ سمجھ لیا جائے۔ یہاں تو صرف ادھورے اور اَن گڑھ قسم کے مقلدین کی بہتات ہے ورنہ مغرب میں جو ان نظریوں کے بنیاد گزار ٹھہرے ہیں وہ افلاطون اور ارسطو کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھاتے۔ چنانچہ یہ بات پوری ذمہ داری سے کہی جاسکتی ہے کہ مذکورہ بالا سوالات کے حتمی جواب ارسطو اور لان جائی نس جیسے مفکرین اور ناقدین کے مطالعے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

ارسطو نے واضح کردیا ہے کہ ہومر (Homer) کیوں شاعر ہے لور دوسرے نظم نگار کیوں نہیں۔ پھر اُس نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اچھی لور بری شاعری کو پرکھنے کا پیمانہ ایک ہی ہونا چاہئے۔ ارسطو نے شاعری کو انسانی ذہن کا آزاد عمل قرار دیا ہے اور اسے کسی بنے بنائے فارمولے کا پابند نہیں رکھا ہے۔

لان جائی نس (Longinus) نے عظیم شاعری کے لیے ایک بات شروع ہی میں واضح کردی ہے کہ وہ عظیم ذہن کی تخلیق ہوتی ہے۔ کسی تخلیقی شہ کار کو پرکھنے کا معیار اس نے یہ بتایا ہے کہ اسے ہر دور ہر طبقے اور ہر جنس کے افراد یکساں طور پر طویل تر ادوار میں پسند کرتے آرہے ہوں۔ گویا زمانہ گزراں اور تغیراتِ عالم کی کسوٹی پر اس کا دوام ثابت ہو چکا ہو۔

اس کے بعد حیل و حجت، قیل و قال کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ اس دور میں لابی، پرچی، گروہ بندی، رشوت قبضہ گروپ جیسی گھٹیا اور غیر ادبی اصطلاحیں استعمال کر کے مرض کی تشخیص

کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے جالینوس اور ابن سینا کو چھوڑ کر اتائی (جی ہاں اس کی املا یہی ہے یہ عطا سے عطائی نہیں) عطاروں کو

اے طبیب جملہ علت ہائے ما

کہہ کر پکارا جائے۔

صابر ظفر کے بارہ شعری مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ اُس کا ایک جامع انتخاب کرتے وقت یہ خیالات بھی ذہن پر دستک دینے لگے۔ صابر ظفر کا پہلا شعری مجموعہ "ابتدا" کا انتخاب بھی میں نے ہی کیا تھا۔ یہ ۱۹۷۴ء کی بات ہے۔ صابر ظفر کوئٹہ میں تھا اور میں اسی زمانے میں بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ تھا۔

صابر ظفر نے شاعری کی دنیا میں خود کو مسلسل کاوش، سنجیدہ بیانی اور تازہ کاری کی بنیاد پر منوایا ہے۔ اس لیے اب یہ بحث تو ان کے سلسلے میں اُٹھ ہی نہیں سکتی کہ وہ جینوئن شاعر ہے یا نہیں۔

صابر ظفر شاعری کے اندر کا آدمی ہے۔ وہ شاعری کے لیے اجنبی یا آوٹ سائڈر نہیں ہے۔ اس کا اندازہ صابر ظفر کی مجموعی شاعری سے ہوتا ہے کیونکہ اس کے یہاں بہتر اظہار اور کچھ کر دکھانے کی ہمہ وقت تڑپ کا عنصر ملتا ہے۔ یہ تڑپ یہ تلاش یہ جستجو اُسے بحور، اوزان، زبان، موضوعات، اسالیب، ہیئت کے تجربوں، قدیم و جدید کی راہداریوں، لوک داستان کی چوپایوں میں کشاں کشاں لیے پھرتی ہے۔

صابر ظفر سماجی طور پر مجھ سے بہت قریب بھی نہیں اور بہت دُور بھی نہیں۔ میں اُسے ادبی اور ذاتی حوالوں سے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اُس کا سارا ادبی سفر میرے سامنے طے ہوا ہے۔ اُس کی ذاتی زندگی کے نشیب و فراز اور تخلیقی کاوشوں کی رفتار میری نگاہوں میں محفوظ ہے۔

صابر ظفر نے گھسٹ گھسٹ کر، کسی پینترہ بازی یا داؤ گھات سے اپنا شاعرانہ مرتبہ حاصل نہیں کیا ہے۔ "ابتدا" ہی سے ادب کی دنیا میں اُس کی پہچان ہو چکی تھی۔ اس طرح کے شعر لکھنے والے کو کسی پرچی یا کسی سفارش کی ضرورت نہیں تھی۔

خجل بہت ہوں کہ آوارگی بھی ڈھب سے نہ کی
میں دربدر تو پھرا لیکن اپنے گھر بھی گیا

کتنا مشکل ہے محبت میں نباہ
کتنا آساں ہے سہاگن ہونا

خبر ہے گرم کہ ہے آج میرے قتل کی رات
کہاں گئے مرے بازو کہاں گئے مرے ہات

اگر کسی شاعر کی سوانح حیات اُس کی شاعری کی گواہی بن سکتی ہے تو صابر ظفر یقیناً یہ گواہی اپنے ساتھ لایا ہے۔ رسمیاتِ شعر تو ہر شاعر کی فنی ریاضت اور تخلیقی شعور کا ناگزیر حصہ ہوتی ہی ہیں۔ دراصل شاعری ان اشعار کے پہلو بہ پہلو چلتی ہے ۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا
(آتش)

اے شعر دلفریب نہ ہو تُو تو غم نہیں
پر حیف تجھ پہ ہے جو نہ ہو دلگداز تُو
(حالی)

کاریگران شعر سے پوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے
(جگر)

صابر ظفر اپنے ہم عصروں میں اسی لیے ممتاز اور قابلِ توجہ ہے کہ اُس کے یہاں مرصع سازی بھی ہے اور گدازو اثر بھی۔ شاعر جب تک اپنے بنیادی اوزار سے لیس نہیں ہو گا، وہ بنائے گا کیا۔ موسیقار سُر تال سے ناواقف ہو، معمار پیمایش اور تعمیر کے سازوسامان سے بے بہرہ ہو تو اُسے کس چیز کی داد دی جائے۔ صابر ظفر فن کے معاملے میں بہت مضبوط ہے اسی لیے جب وہ

اوزان و بحور، ہیئت و اسلوب کے تجربے کرتا ہے تو اُن میں ایک تخلیقی جواز اور شاعرانہ اُپج ضرور ہوتی ہے۔

صابر ظفر کی شاعری میں غزل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اُسے شاید اصرار بھی غزل گوئی پر ہی ہے۔ غزل کا مطالعہ کیجئے یا خود غزل کہیے۔ یہ اندازہ جلد ہی ہو جائے گا کہ غزل کہنا بہت آسان بھی ہے اور بہت مشکل بھی۔ اس میں شاعری کی دیگر شرایط کی طرح روایت سے وابستگی کی شرط بھی بہت اہم ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنے ایک مشہور اور اہم مقالے میں اس کی وضاحت کردی ہے کہ روایت کو قدامت کے معنی میں استعمال کرنا نہیں چاہیے۔ دراصل جدید کے قدو قامت کی بلندی میں روایت کا قد بھی شامل ہوتا ہے۔ صابر ظفر نے تمام لسانی اور اسلوبیاتی جدت طرازیوں کے باوجود غزل کی بنیادی روایت سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا۔

جدت نئے نئے الفاظ و تراکیب، علامات و اشارات کے استعمال کرنے کا نام نہیں بلکہ بے جان لفظوں میں نئی کیمیاگری اور مسیحائی کا نام ہے۔ غزل کے کلاسیکی استعاروں اور تشبیہوں کو دیکھئے۔ بہت آسانی سے اُن کی ایک جامع فہرست بنائی جاسکتی ہے لیکن ان کا تخلیقی استعمال ہی شاعر کو منفرد بناتا ہے۔

صابر ظفر کے یہ چند اشعار دیکھئے۔

خدا کا ملنا نہ ملنا خدا کی مرضی ہے
مگر ہمیں ہے یہ دھڑکا صنم گئے تو گئے

پہلے بربادی میں شریک
اب مصروف نصیحت میں

اچھالیں ہم بھی کوئی سرخوشی کی لہر، اگر
گرفتِ غم سے ہمیں سانس نکلنے دیں

ہم قتل کے بھی رہے نہ لائق
وہ تیغ نیام ہو گئی ہے

کسی کو دوش نہ دیں اس لیے بھٹکنے کا
کہ شاید اپنی ہی آوارگی کے ساتھ ہیں ہم

ندی ہی جا کے گری ہے سدا سمندر میں
کبھی اُچھل کے سمندر ندی میں آیا نہیں

ردِ عمل بھی ہو اگر، کوئی خلل بھی ہو اگر
پیچھے نہیں ہٹیں گے ہم، کوئی سوال کیجئے

درخت کاٹ کے سایہ فروخت کرتے ہیں
اور اس کے بعد کڑی دھوپ سے گزرتے ہیں

غیر سے مانگا پیرہن، ایسا ہے جیسے ہو کفن
چاہے لباسِ خاک ہو، اپنے لباس میں رہو

اُجڑ رہا ہو کوئی چاہے بس رہا ہو کوئی
بنانے والے تو اپنی خبر بناتے ہیں

گھر کی ویرانی کو اکثر سرِ بازار لیے پھرتا تھا
آج بازار کو لے آیا ہوں گھر رونقِ بازار سمیت

ہم ہی آواز اُٹھاتے رہے ظالم کے خلاف
تیرے ہونٹوں پہ تو خود ساختہ، تالے ہی ملے

مخل ہے میرے سخن میں اک ایسے عجز کی پھانس
جسے میں کہہ نہیں سکتا، مری زباں سے نکل

جہان اور بھی ہوں گے ظفر تلاش تو کر
خیال ہی میں سہی قیدِ دو جہاں سے نکل

تلاش جس کی ہے اُس کا نشاں نہیں معلوم
پکارنا ہے اُسے، جس کا نام یاد نہیں

خموش ہو گیا یوں کوئی بات کرتے ہوئے
ہوا سے کچھ نہ کہے جیسے گُل بکھرتے ہوئے

میں زینہ زینہ جسے لے گیا بلندی پر
وہ میرے ساتھ نہ تھا سیڑھیاں اُترتے ہوئے

داستاں ظلم کی خود لکھتے ہو کیوں مظلومو
کیا یہاں کاتبِ تقدیر نہیں ہے کوئی

تڑختی ٹوٹتی سنجیدگی سے عمر جو گزری
وہ اک معصوم بچے کی شرارت ہو بھی سکتی تھی

یہ تھا محض خیال کہ چاہت کی صورت میں
ہونٹوں پر ہونٹوں کا تحفہ رہ جاتا تھا

یوں تو میں نے اس پورے مجموعے کا انتخاب کیا ہے۔ اس میں سے اشعار پیش کرنے سے کیا حاصل ؟ لیکن اوپر درج شدہ اشعار اپنے تنوع اور مزاج کے جو زاویے اُبھار رہے ہیں، اُن میں صابر ظفر کے کلام کا ایک خردبینی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

غزل ایک بنی بنائی ساخت رکھتی ہے جس میں کسی توڑ پھوڑ یا نئے اقدام کی گنجائش کم ہے۔ ادھر کچھ افراد نے غزل کے ساتھ مذاق کیا ہے اور آزاد غزل بلکہ نثری غزل جیسی ناکام جسارتیں بھی کی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ میں چوکور دائرہ بنا رہا ہوں صابر ظفر نے اس قسم کی اُتھلی اور لایعنی روشوں سے گریز کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ غزل میں بھی تجربوں کی بہت گنجایشیں ہیں لیکن اس کے لیے صابر ظفر جیسا تخلیقی جوہر چاہئے۔

صابر ظفر نے زبان کے معاملے میں بھی اپنے گرد و پیش کے لسانی رویوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ایسے الفاظ کا تعلق پاکستان کی تمام زبانوں کے علاوہ انگریزی کے ایسے الفاظ سے بھی ہے جنہیں روزمرہ زندگی میں ہم استعمال کرتے ہیں۔ پھر بھی صابر ظفر نے کبھی "انوکھی زبان" لکھنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اس کا اپنا خیال یہ ہے کہ

پڑا نہ فرق انوکھی زبان لکھنے سے
زمیں زمیں ہی رہی آسمان لکھنے سے

شاعری آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ شاعری کی زبان میں بھی متکلم، حاضر اور غائب کے صیغے استعمال ہوتے ہیں جنہیں ماہر لسانیات (Buhler) بوہلر نے Conatine emo-tive اور Referntial کی اصطلاحوں سے واضح کیا ہے۔ تاہم رومن یاکب سن (Roman Jacobson) نے ان تین صورتوں کا اور اضافہ کیا ہے

Poetic, Phatiec and Metalingual اس تقسیم کی ضرورت بھی دراصل شعریاتی اور لسانیاتی مطالعوں اور تجزیوں ہی کی وجہ سے پیش آئی۔ رزمیہ، غنائیہ، طربیہ، رثائیہ

شاعری کے اسالیب بیان مختلف ہو سکتے ہیں۔ لیکن کیا واحد یا جمع متکلم کسی اور وجود کا جذباتی، نفسیاتی، حسیاتی اور جمالیاتی روپ دھار کر شاعری میں اُس کی ترجمانی کر سکتا ہے۔

یہ سوال ہمیشہ بہت اہم رہا ہے۔ ہمارے یہاں عظمت اللہ خاں نے

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا
مرے دل کو یہ آگ جلا سی گئی

میں ایک ناکام اور ہجر زدہ لڑکی کے محسوسات کو نظم کر دیا ہے۔ صابر ظفر نے غزل میں یہ تجربہ کیا ہے کہ جنس مخالف کی مختلف کیفیات کو اسی کی طرف سے غزل میں ڈھال دیا ہے یعنی غزل کا یہ تجربہ نہ "بازناں حرف گفتن" رہا اور نہ لکھنو یا دلّی کی ریختی۔ صابر ظفر کے اس تخلیقی تجربے کے خصوصی تجزیے اور مطالعے کی ضرورت ہے اس نوع کے چند اشعار دیکھیے۔

نجانے کیوں تھی میں اُس کے بغیر بے کل سی
کہ کھردرا سا تھا وہ اور میں تھی مخمل سی

جب اُس کے وصل کی حدت مجھے نصیب ہوئی
دہک رہی تھی میں اُس وقت سرخ صندل سی

وہ میری روح میں روپوش تھا کہیں شاید
کہ جس کے ہونے سے پھوٹی میں نرم کونپل سی

پیالہ حسن کا اُس کے لبوں کو چھو آیا
کہ ہو گئی تھی میں رات آپ، اپنے سانول سی

اگر چپکتی نہ اُس سے تو اور کیا کرتی
کہ بھیگا اُس کا بدن اور میں تھی ململ سی

رات ساری جاگتی سوتی رہی میں
ایک میٹھے درد میں ڈوبی رہی میں

ہونٹ اُس کے آنکھیں اس کی بات اُس کے
چومنے کے خواب ہی بنتی رہی میں

روپ میرا لاٹ سلگنے کی ہو جیسے
کھنچتا وہ کش تو جل اُٹھتی رہی میں

سانس روکے رات اُس کے پاس پہنچی
اور واپس آنے تک سہمی رہی میں

جانے ملے کس عمر میں وہ
جس کو چاہا بچپن سے

بیٹھ گئی آواز مری
ڈولی اُٹھی آنگن سے

میں نے کوئی تکرار نہ کی
اپنے اُس من موہن سے

چادر ایک بنا ڈالی
اُس نے دھوپ کی کترن سے

غزل کی بات الگ ہے لیکن اس طرح کی شاعری برصغیر کے لیے نئی نہیں۔ ہندی شاعری اور ہماری مثنویات میں اس کا عکس ملتا ہے۔ اظہارِ عشق عورت کی جانب سے۔ سارے جذبات و معاملات کی عکاسی شرنگار رس کی شرطوں کو پورا کرتے ہوئے۔ لوک داستانوں میں یہ لہر ہمیشہ سے موجود رہی۔ صابر ظفر نے برصغیر کی لوک داستانوں سے بہت استفادہ کیا ہے۔ ہیر رانجھا، سسی پنوں، سہتی مراد، سوہنی مہینوال، مرزا صاحباں، کے صرف نام ہی اس کی غزل میں نہیں آتے ہیں بلکہ اُن کی تہذیبی اور تخلیقی لپک بھی اس کے اشعار میں موجود ہے۔ اسی طرح صابر ظفر نے ہیر اور سیف الملوک کی بحروں کو بھی غزل میں استعمال کیا ہے۔ سندھی، بلوچی اور پشتو شاعری کے آہنگوں سے بھی فائدہ اُٹھایا ہے۔ اس سب کاوشِ تخلیق کے پیچھے ایک طرف تو اپنی سکت کو آزمانا ہے دوسری طرف غزل کے دامن میں وسعتوں کا کھوج لگانا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں ؎

نئی غزل کے لیے راستے نکلنے دیں
خیال دل میں ہیں جو سر پھرے نکلنے دیں

ظاہر ہے کہ سر پھرے خیالات کسی روایتی نظم و ضبط اور آئین و آداب کے تو پابند نہیں ہوں گے۔ اُن کا تخلیقی روپ ہی بتا سکے گا کہ صابر ظفر نئی غزل کے لیے راستے نکالنے میں کہاں تک کامیاب رہے۔

صابر ظفر کی غزل کا ایک اور رُخ یہ بھی ہے کہ بعض غزلیں چند اشعار پر مشتمل ہیں اور بعض مسلسل اور متعدد اشعار کی حامل ہیں۔ میں نے اپنے انتخاب میں ایسی طویل غزلیں بھی شامل کی ہیں تاکہ ہر غزل اپنی کلیت میں اُن مفاہیم کی فضا کو منکشف کر سکے جو تخلیقی عمل کے لیے ناگزیر رہی ہے۔

اپنی غزل میں صابر ظفر نے ہر مزاج اور ہر سطح کے تجربے کیے ہیں۔ دعائیں دی ہیں تو کھلی کھلی گالیوں سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ اس کی غزل میں ذاتی تجربوں کے علاوہ سماجی، سیاسی،

جمالیاتی، جنسی اور نفسیاتی کیفیات کا بھی بھرپور اظہار ہوا ہے۔ ان کی حسیاتی شاعری اکثر جگہ اجنتا، ایلورا، کھجوراہو اور کام شاستر کی علامتوں تک ذہن کو لے جاتی ہیں۔ کلام کو عریاں اور مبتذل کیے بغیر ایک جمالیاتی پیکر میں ڈھال دینا آسان کام نہیں۔ صابر ظفر اکثر جگہ اس اظہار میں کامیاب رہے ہیں۔

ذاتی زندگی کے حوالے سے ایک آخری بات جو صابر ظفر کے لیے بھی تازہ ترین سانحے کی حیثیت رکھتی ہے۔ صابر ظفر جس نے زندگی کے انفرادی اور اجتماعی معاملات کو شاعری کی زبان میں ڈھالا ہو، اپنے جوان بیٹے کے قتل کے غم سے کس طرح اپنی شاعری کو بچا سکتا تھا۔ یہ رُخ بھی عجیب فضا لے کر آیا ہے۔ اشعار میں جو غم ڈھلا ہے وہ غم کی سیدھی سادی پرچھائیں نہیں ہے بلکہ ضبط غم کی شدید لہر جو زہر غم کے رگ و پے میں اُتر جانے سے پیدا ہوئی۔ اشعار کیا ہیں۔ یہ سانحہ جس طرح گزرا اُس کی جذباتی ایف۔ آئی۔ آر ہے جو کسی تھانے میں نہیں بلکہ ادب کے صفحات پر درج کرائی گئی ہے اسی لیے اس کا انداز بھی تھانے داری سے بہت مختلف ہے۔

وہ مجھے چھوڑ گیا، دکھ بھری حیرانی میں
خاک پر قتل ہوا اور ملا پانی میں

بے آہٹ چلی آتی ہے موت
اور واپس نہیں جاتی ہے موت

اور تو سب محو ہیں، اپنے شب وروز میں
چین مجھے ہی نہیں، میں ہی مصیبت میں ہوں

بچھڑا اپنا لال تو یہ احساس ہوا
کیسے کیسے لال بچھڑ گئے لوگوں کے

نہیں بچا مرے کاسے میں سانس کا سکہ
کہ ہو گئی ہے مری ساری زندگی قلاش

کیا خبر تھی تو گھر نہ آئے گا
اور پھر عمر بھر نہ آئے گا

اہلِ خانہ کچھ سلامت ہیں ابھی تک اور اک صابر ظفر
اے اجل آ، ہو نہیں پایا ابھی برباد گھر پوری طرح

سب مضامینِ مرگ کا حاصل
ایک مضمون کہ لگ گئی مجھے چپ

کوئی جیے کہ مرے شاعری کیے جاؤں
یہ شاعری کہیں میرے لیے سزا تو نہیں

وہ دو قدم ہی چلا اور گزر گیا جاں سے
اجل کو ڈھونڈ لیا اُس نے راہ کھوئے بغیر

سنتا ہوں تیری شہنائی بسم اللہ خاں
دیکھ مگر میری تنہائی بسم اللہ خاں

اتنی کم عمری میں سر کیا پکا لگتا
اس کمسن نے عمر جو پائی، بسم اللہ خاں

موت کا راگ جو پروائی نے چھیڑا ہے وہ سن
میں روتا ہوں یا پروائی بسم اللہ خاں

صابر ظفر زندگی میں بہت سانحوں سے گزرا ہے لیکن یہ اُس کی زندگی کا سب سے الم ناک اور بھیانک سانحہ ہے۔ بسم اللہ خان کی شہنائی سے ایک اور قدیم فن پارہ ذہن میں تازہ ہوا۔ مولانا روم نے کیا کہہ دیا ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

پروفیسر سحر انصاری

دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے
اگرچہ بولتا کوئی نہیں ہے

میں ایسے جمگھٹے میں کھو گیا ہوں
جہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے

رُکوں تو منزلیں ہی منزلیں ہیں
چلوں تو راستہ کوئی نہیں ہے

کھلی ہیں کھڑکیاں ہر گھر کی لیکن
گلی میں جھانکتا کوئی نہیں ہے

کسی سے آشنا ایسا ہوا ہوں
مجھے پہچانتا کوئی نہیں ہے

کلام کرتا ہوا راستہ بناتا ہُوا
گزر رہا ہُوں مَیں اپنی فضا بناتا ہُوا

مجھے نہ ڈھانپ سکی عمر بھر کی بخیہ گری
برہنہ رہ گیا مَیں تو قبا بناتا ہُوا

یہی بہار ہے میری کہ مَیں گزرتا ہوں
ہر ایک خشک شجر کو ہرا بناتا ہُوا

کسی بھی شاخ نے دیکھا نہیں پلٹ کے اُسے
پرندہ سوکھ گیا گھونسلا بناتا ہُوا

اب اور کیا ہو ظفرؔ انتہا مشقّت کی
شکستہ ہوگیا مَیں آئنہ بناتا ہُوا

تم اپنے گرد حصاروں کا سلسلہ رکھنا
مگر ہمارے لیے کوئی راستہ رکھنا

ہزار سانحے پردیس میں گزرتے ہیں
جو ہو سکے تو ذرا ہم سے رابطہ رکھنا

خزاں رکھے گی درختوں کو بے ثمر کب تک
گزر ہی جائے گی یہ رُت بھی، حوصلہ رکھنا

تمہارے ساتھ سدا رہ سکیں ضروری نہیں
اکیلے پن میں کوئی دوست دوسرا رکھنا

زیادہ دیر ظفؔر ظلم رہ نہیں سکتا
اگر اب آئیں کڑے دن تو جی کڑا رکھنا

صورتِ مرگ فقط راہ کی ٹھوکر نکلی
زندگی تو مرے اندازے سے کم تر نکلی

دھوپ نے دُکھ دیا لیکن مجھے تنہا نہ کیا
ایک پرچھائیں مرے جسم سے باہر نکلی

تیرے چہرے سے کھُلا مجھ سے بچھڑنے کا ملال
شکل اک اور تری شکل کے اندر نکلی

صرف چکر ہی نہیں پاؤں میں زنجیر بھی ہے
میری حالت مری قسمت سے بھی ابتر نکلی

آتشِ کبر نکلتی ہی نہ تھی دل سے ظفرؔ
چوبِ منبر کو جلایا تو یہ کافر نکلی

ہماری جان ہے جانی تو جائے
مگر یہ دل کی ویرانی تو جائے

خداوندا کوئی دکھ مستقل دے
کہ آن جانی پریشانی تو جائے

برس لو کھل کے اے اشکو برس لو
کہ آئے دن کی طغیانی تو جائے

لباسِ خاک ہی پہناؤ ہم کو
کسی صورت یہ عریانی تو جائے

لگا لو پھر گلے صابر ظفر کو
تمہاری کچھ پشیمانی تو جائے

Nice gud!

کوئی تو ترکِ مراسم پہ واسطہ رہ جائے
وہ ہم نوا نہ رہے صورت آشنا رہ جائے

عجب نہیں کہ مرا بوجھ بھی نہ مجھ سے اُٹھے
جہاں پڑا ہے زرِ جاں وہیں پڑا رہ جائے

میں سوچتا ہوں مجھے انتظار کس کا ہے
کواڑ رات کو گھر کا اگر کھلا رہ جائے

کسے خبر کہ اسی فرشِ سنگ پر سو جاؤں
مِرے مکان میں بستر مِرا بچھا رہ جائے

Nice

ظفرؔ ہے بہتری اس میں کہ مَیں خموش رہوں
کُھلے زبان تو عزت کسی کی کیا رہ جائے

خزاں کی رُت ہے جنم دن ہے اور دھواں اور پھول
ہَوا بکھیر گئی موم بتّیاں اور پھول

وہ لوگ آج خود اِک داستاں کا حصہ ہیں
جنہیں عزیز تھے قصے کہانیاں اور پھول

یہ سب ترے مِرے اظہار کی علامتیں ہیں
شفق کے رنگ میں شعلہ، لہو، زباں اور پھول

یقین کر کہ یہی ہے بجھے دلوں کا علاج
تری وفا تری چاہت ترا گماں اور پھول

ظفرؔ مَیں صورتِ خوشبو قیام کرتا ہُوں
سوایک سے مجھے لگتے ہیں سب مکاں اور پھول

ساتھ تیرے، ترا ہم زاد نہیں رہ سکتا
رشتۂ نسبتِ اجداد نہیں رہ سکتا

اب تو بارود سے ہوتی ہے یہاں کوہ کنی
اب مَیں ہم پیشۂ فرہاد نہیں رہ سکتا

پسِ ہنگامِ رہائی ہے صدائے زنجیر
یعنی مَیں دیر تک آزاد نہیں رہ سکتا

رونا اِس کا ہے کہ ہوں خانماں برباد یہاں
اور یہاں خانماں برباد نہیں رہ سکتا

اپنے مطلب کے لیے جس نے عقائد بدلے
صابر اب وہ مرا اُستاد نہیں رہ سکتا

عجب اِک بے یقینی کی فضا ہے
یہاں ہونا نہ ہونا ایک سا ہے

تغیّر کا عمل جاری ہے یعنی
دکھوں میں کچھ اضافہ ہوگیا ہے

ٹھکانا ہی نہیں کوئی ابھی تک
جو پنچھی اُڑ رہا تھا اُڑ رہا ہے

ہمارا اُس کا اب رشتہ نہ پوچھو
تعلق ہے مگر ٹوٹا ہُوا ہے

کسی کے راستے میں خاک ہونا ہے
فقط اپنا تماشا دیکھنا ہے

ہر اک پور اُس کی مشعل ہے کہ جس کو
لووں پر ہاتھ رکھنا آ گیا ہے

محبت کو سمجھتا ہے تماشا
کوئی اگلی صفوں میں آ گیا ہے

اگر اِک بار کُھل جائے کوئی آنکھ
تو پھر اُس کا مقدر جاگنا ہے

پڑا نہ فرق انوکھی زبان لکھنے سے
زمیں، زمیں ہی رہی آسمان لکھنے سے

نہ جس سے کوئی تعلق رہا کبھی میرا
وہ بن سکا نہ مِری جان، جان لکھنے سے

پناہ مل نہ سکی ایک پل کبھی مجھ کو
کسی اُجاڑ جگہ کو مکان لکھنے سے

کڑی تپش سے جھلستا رہا بدن میرا
کہ دھوپ، دھوپ رہی سایبان لکھنے سے

کنارے لگ نہ سکی ڈوبتی ہُوئی کشتی
کسی بھنور کو ظفرؔ بادبان لکھنے سے

دن کو مسمار ہوئے رات کو تعمیر ہوئے
خواب ہی خواب فقط روح کی جاگیر ہوئے

عمر بھر لکھتے رہے پھر بھی ورق سادہ رہا
جانے کیا لفظ تھے جو ہم سے نہ تحریر ہوئے

یہ الگ دکھ ہے کہ ہیں تیرے دکھوں سے آزاد
یہ الگ قید ہے ہم کیوں نہیں زنجیر ہوئے

دیدہ و دل میں ترے عکس کی تشکیل سے ہم
دھول سے پھول ہوئے رنگ سے تصویر ہوئے

کچھ نہیں یاد کہ شب، رقص کی محفل میں ظفرؔ
ہم جدا کس سے ہوئے، کس سے بغل گیر ہوئے

برہنگی کا یہ درماں ہے تیرگی میں جئیں
چراغ ہو تو جلائیں لباس ہو تو سئیں

دلوں پہ حُسن کی شبنم اتارنے والے
پیالہ ہو تو اُچھالیں شراب ہو تو پئیں

یہ سادہ دل جو تمھیں دیکھ دیکھ مرتے ہیں
ستم کرو تو دعا دیں کرم کرو تو جئیں

رفو سے اور دریدہ ہو پیرہن دل کا
تری جھکی ہوئی پلکیں ہی اب اُٹھیں تو سئیں

تمھارے حق میں چلو ہم ہی بولتے ہیں ظفرؔ
یہ زہر تم نہیں پیتے تو لاؤ ہم ہی پئیں

میں تھا ستم زدہ تو ستم گر بھی مَیں ہی تھا
گھایل تھا جس سے جسم وہ خنجر بھی مَیں ہی تھا

اپنے لیے مَیں آپ تماشا بنا رہا
میں جس کو تک رہا تھا وہ منظر بھی مَیں ہی تھا

میرے سوا نہ میرے قریب آسکا کوئی
خوشبو تھا مَیں تو خود سے معطّر بھی مَیں ہی تھا

خود مَیں نے اپنے سامنے پھیلائے اپنے ہاتھ
داتا بھی مَیں ہی تھا تو گداگر بھی مَیں ہی تھا

کیا تجھ کو یاد ہے کہ پسِ پشتِ کائنات
جس میں اٹھا تھا حشر وہ محشر بھی مَیں ہی تھا

ہم سفر جو کھو گئے اُن سے ملا سکتے نہیں
کون کس جانب گیا، رستے بتا سکتے نہیں

راستے میں پیڑ ہیں، بس دیکھتے جاتے ہیں ہم
ان کے سائے تو ہمارے ساتھ جا سکتے نہیں

نقشِ پا کچھ رفتگاں کے خاک پر محفوظ ہیں
یہ نشانی دیکھ سکتے ہیں اُٹھا سکتے نہیں

صرف اتنی بات پر کیوں دوستوں کو چھوڑ دیں
ساتھ دے سکتے نہیں وعدہ نبھا سکتے نہیں

سامنے اک دوسرے کے اور حجاب اِتنا ظفرؔ
آئنے نم ہوں تو یہ چہرے دکھا سکتے نہیں

عکس پانی میں اگر قید کیا جاسکتا
عین ممکن تھا مَیں اُس شخص کو اپنا سکتا

کاش کچھ دیر نہ پلکوں پہ ٹھہرتی شبنم
میں اسے صبر کا مفہوم تو سمجھا سکتا

بے سہارا کوئی ملتا ہے تو دکھ ہوتا ہے
میں بھی کیا ہوں کہ کسی کام نہیں آسکتا

کتنی بے سُود جدُائی ہے کہ دکھ ہے نہ ملال
کوئی دھوکا ہی وہ دیتا کہ مَیں پچھتا سکتا

روٹھنے والے کی آنکھیں بھی تو پُرنم تھیں ظفؔر
مجھ سے بے اشک بھلا کیسے رہا جاسکتا

اُس کا جُدا تھا رنگ، جدا اپنا رنگ تھا
ویسے بھی وہ لباس مِرے تن پہ تنگ تھا

جل بھی رہا تھا مَیں وہاں، بجھ بھی رہا تھا مَیں
محفل میں شمع تھی نہ ہی کوئی پتنگ تھا

شاید لکھی تھی سنگ زنی ہی نصیب میں
دیوانہ ورنہ کب کوئی مشتاقِ سنگ تھا

مدہوش مَیں تھا، پھر بھی نہ بھُولا وہ صبح تک
اُس گل بدن کا رات کو جو رنگ ڈھنگ تھا

سانسوں میں اُس کی سانسوں کا ایسے رہا گماں
جیسے وہ میرے گرم لہو کی ترنگ تھا

رہنے دیا نہ ساتھ، مزاجوں کے فرق نے
میں سیدھا سادا شخص تھا وہ شوخ و شنگ تھا

تُو نے بھی حوصلہ نہ دیا بے بسی کے وقت
تُو تو مِری اُمید تھا میری اُمنگ تھا

سمٹا رہا کہ صرف سمٹنے میں تھی اماں
جاتا کہاں غزال، مقابل پلنگ تھا

اِک بوند بھی نہیں تھی کہ مَیں ڈوب ہی سکوں
دریا میں ہر کوئی مِرے آگے نہنگ تھا

میں لا نہیں سکا اُسے اپنے خیال میں
ایسا لگا ہوا مِری سوچوں پہ زنگ تھا

ہم تھے کہ شاعری ہی سے فرصت نہ تھی ہمیں
ورنہ ہر آدمی یہاں مصروفِ جنگ تھا

پردے میں رہ کے بھی رہے پردے پہ ہم سدا
اظہارِ ہست و بود کا اپنا یہ ڈھنگ تھا

تاثیر کچھ نہ کچھ تو سبھی کے سخن میں تھی
پر میرؔ کے کلام سے جی اپنا دنگ تھا

ڈیرے پہ اُس کے رات، انوکھے نشے میں گم
صابر ظفرؔ کے رُوپ میں کوئی ملنگ تھا

Jealous
Ihsan

مِری جاں ہے قیدِ طویل میں
کوئی پیڑ جیسے فصیل میں

کوئی پل ستارہ صفت نہیں
مِری شامِ عمرِ قلیل میں

ہوں مثالِ ماہیٔ ریگ مَیں
نہ مَیں جال میں، نہ مَیں جھیل میں

ابھی منتشر ہیں اُسی طرح
کئی خواب چشمِ علیل میں

اُسے خُوش نوائی پہ ناز ہے
سو مَیں چپ ہوں اُس کی دلیل میں

بُت بنے بیٹھنا، پہلو بھی بدلتے رہنا
ملنا خوش خوش مگر اندر سے پگھلتے رہنا

کیا خبر شعلۂ تصویر ہی کُندن کر دے
آخری پور تلک دھیان میں جلتے رہنا

اتنے بے حس کبھی پہلے نہ تھے، شاید تم نے
زندگی جان لیا عمر کا ڈھلتے رہنا

ہم نہ آئے تو کوئی اور بہار آئے گی
یاد کرنا ہمیں اور پھولتے پھلتے رہنا

شعر کہنے کا سفر ایسا ہے جیسے کہ ظفرؔ
دائرے کھینچنا، پھر اُن سے نکلتے رہنا

ہم سفر کوئی نہیں تو شور و شر کس کے لیے
اے مسافر! یہ صدائے رہ گزر کس کے لیے

خود کشی سے باز رکھّا میں نے اپنے آپ کو
مر تو جانا تھا مجھے، مرتا مگر کس کے لیے

کون آتا ہے مِرے پیچھے یہ کیسا وہم ہے
میں ٹھہر جاتا ہوں ہر اِک موڑ پر، کس کے لیے

یہ جو رنگِ نامرادی کِھل رہا ہے چار سُو
اے خزاں اس کا سبب کیا ہے یہ زر کس کے لیے

جان دینا اُس ستم گر کو اگر طے ہے تو پھر
دل بناتا ہے محبت کو سپر، کس کے لیے

میری مٹی کے مقدر میں بکھرنا تھا اگر
چاک پر رکھّا اُسے، اے کوزہ گر کس کے لیے

کر دیا مجھ کو حوالے جب خلائے دہر کے
پھر ہُوا کس کے لیے پھر خشک و تر کس کے لیے

سننے والا جب نہیں تو پھر دہائی ہے عبث
دیکھنے والا نہیں تو چشمِ تر کس کے لیے

اعتبارِ زندگی ہی اُٹھ گیا تو فن مِرا
معتبر کس کے لیے، نامعتبر کس کے لیے

جو قفس کی سمت آئے، پوچھوں حسرت سے اُسے
یہ شجر کس کے لیے ہیں یہ ثمر کس کے لیے

جو ستارہ تھا تمھارے نام کا، وہ کھو چکا
پھر رہے ہو رات کے پچھلے پہر کس کے لیے

آج کل عیب و ہنر میں کون کرتا ہے تمیز
اک بشر میں اس قدر عیب و ہنر کس کے لیے

لَوٹ کر آنا نہیں ممکن، اگر ممکن ہُوا
آؤں گا اِس دہر میں بارِ دگر کس کے لیے

ہو رہی ہے دیر کس کا دم اُکھڑنے میں یہاں
اک جگہ ہیں جمع اتنے چارہ گر کس کے لیے

ایک دیوانہ برہنہ گھومتا ہے شہر میں
پیرہن کس کے لیے دیوار و در کس کے لیے

چین باہر بھی نہیں ہے پھر نجانے کیوں ظفرؔ
دکھ سا ہوتا ہے کہ لَوٹ آیا ہوں گھر کس کے لیے

وصال اُس کا ابھی حاصل نہیں رنگِ جدائی خوبصورت ہے
سمندر کی طرح گہرا ہے وہ اور انتہائی خوبصورت ہے

رقیب اپنا کسی در سے اگر خیرات پالے تو یہی کہنا
ترا کشکول اچھا ہے ترا طرزِ گدائی خوبصورت ہے

مثالِ اشک مَیں اس قریۂ بے خواب میں پل بھر رہا پھر بھی
کسی معمار نے یہ آنکھ کی بستی بسائی خوبصورت ہے

اگر مل ہی گئی ہے پرسشِ احوال کی فرصت تو یہ سن لو
ہمارا حال جو بھی ہو تمہاری لب کشائی خوبصورت ہے

محبت میں ظفرؔ اُس کے چلن کی داد دینا چاہتا ہوں مَیں
بساطِ بے وفائی جس طرح اُس نے بچھائی خوبصورت ہے

اب کہیں اور کہاں خاک بسر ہوں ترے بندے جاکر
زندگی اور بھی مغموم لگے شہر سے آگے جاکر

عدم آباد کے لوگوں کا مزاج ان دنوں کیسا ہوگا
لوٹ آنے کی توقع ہو کسی کو تو وہ پوچھے جاکر

میں گھنا پیڑ ہوں، آیا بھی کبھی جو مِرے سائے کو زوال
ان خزاؤں سے بہت دُور گریں گے مِرے پتّے جاکر

کٹ بھی سکتے ہیں شب و روز مرے، اِن ہی گلی کوچوں میں
تیری جانب ہی اگر لوٹنا ہے تیرے نگر سے جاکر

شاعری پھول اگانے کے سِوا کچھ بھی نہیں ہے تو ظفرؔ
باغ ہی کوئی لگاتا کہ جہاں کھیلتے بچّے جاکر

جہاں سے تنگ ہے جاں سے گزرنا چاہتا ہے
جس آدمی کو بھی دیکھو وہ مرنا چاہتا ہے

وہ عکس ہے کسی آئینے کی ہے اُس کو تلاش
وہ نقش ہے کسی دل پر اُبھرنا چاہتا ہے

سحر کا نُور ہے اور یہ ہے مُدعا اُس کا
حصارِ شب سے نکل کر بکھرنا چاہتا ہے

یہ راز کچھ نہیں کُھلتا کہ آج کا انسان
بگڑنا چاہتا ہے یا سنورنا چاہتا ہے

اب اُس سے میرا یہی اختلاف ہے صابرؔ
میں جینا چاہتا ہُوں اور وہ مرنا چاہتا ہے

خمارِ شب میں جو اک دوسرے پہ گرتے ہیں
وہ لوگ مے سے زیادہ نشے پہ گرتے ہیں

سمیٹ لے گا وہ اپنی کشادہ باہوں میں
جو گر رہے ہیں اِسی آسرے پہ گرتے ہیں

یہ عشق ہے کہ ہوس، اِن دنوں تو پروانے
دیے کی لَو کو بڑھا کر دیے پہ گرتے ہیں

گزارتا ہوں جو شب عشقِ بے معاش کے ساتھ
تو صبح اشک مِرے ناشتے پہ گرتے ہیں

علاجِ اہلِ ستم چاہیے ابھی سے ظفرؔ
ابھی تو سنگ ذرا فاصلے پہ گرتے ہیں

تیرے ملن کو آئی ہیر سیال او رانجھو یار
بول ہُوا کہ نہیں ترا درد بحال او رانجھو یار

آنکھیں پانی ہوں تو کیا ہو دید کی کوئی امید
جیبھ پتاوا ہو تو کیا ہو سوال او رانجھو یار

دل میں اگر ترنگ ہو کوئی، کیوں پھرے کوئی اُداس
پیار ملے تو اچھی لگے دھمال او رانجھو یار

کسی طرح تو کسی کنارے لگے یہ جیون ناؤ
تُو بھی میری طرح کوئی لہر اُچھال او رانجھو یار

کھیڑوں سے چھٹکارا پا کر، جنگل بیلے میں
دیکھا تُو نے کیسا ہُوا وصال او رانجھو یار

پاتال میں تم ہمیں رہنے دو صاحب، آکاش کنارے نہیں چاہئیں ہم کو
اپنا جیون تو ہیں ریت گھروندے، یہ پھول انگارے نہیں چاہئیں ہم کو

کہے رہ رہ کے اپنی دل درویشی، ہم تو چَرانے والے مال مویشی
ہمیں چاہیے پیار کچہری میں پیشی، یہ محل منارے نہیں چاہئیں ہم کو

ہم کنکر ہمیں بھانویں کیا یہ ہیرے، ہم پنچھی ہمیں چاہئیں گھنے ذخیرے
ریتلی مٹی چاہے سینہ چیرے، تم سنگ سہارے نہیں چاہئیں ہم کو

وہاں جانا ہے وہاں دیکھنے ہیں سپنے، جہاں خوشیاں اپنی ہوں روگ ہوں اپنے
جہاں آنکھوں کے سامنے لوگ ہوں اپنے، نا محرم دوارے نہیں چاہئیں ہم کو

ظفرؔ یہی جیون بندھن کافی ہے، اپنا ہو تو ایک بدن کافی ہے
سچی لگن کی ایک کرن کافی ہے جھوٹے لشکارے نہیں چاہئیں ہم کو

جب سُونے پنگھٹ پہ کسی مٹیار کی گاگر بولے
آمیں بجھاؤں پیاس تری، اک عشق سمندر بولے

آئے اور آباد کرے، سنسان حویلی من کی
جیون گنبد بیچ کوئی بے چین کبوتر بولے

دریا بھی مہران کا چپ، صحرا بھی تھر کا چُپ ہے
میں بولوں یا سیہون کا شہباز قلندر بولے

پہنچے گی فریاد کی لے، ہر حال میں اب شیریں تک
ہو جائے خاموش اگر فرہاد تو پتھر بولے

چاہے اسرافیل کوئی اب صُور ہی پھونکے آ کر
بن کے میری روح ظفرؔ مرے تن کے اندر بولے

ٹھہر گئی جب تیری سواری، ٹھہر گئیں کئی صدیاں
ملن سمے کا درپن ٹوٹا، بکھر گئیں کئی صدیاں

تیری کھوج میں جانے کتنے خاک ہوئے دیوانے
کُوک گئی تری، جس جس تھل میں، اُدھر گئیں کئی صدیاں

بھڑکے گا جب عشق الاؤ، بھر دے گا سب گھاؤ
دُوری کی برفیلی رت میں، ٹھٹھر گئیں کئی صدیاں

میں نے تجھ کو کتنا ڈھونڈا، کیسے یقین دلاتا
جب صدیوں کو گواہ بنایا، مکر گئیں کئی صدیاں

اب تو موڑ مُہاریں سانول اب تو موڑ مُہاریں
گزر گئیں کئی صدیاں تجھ بِن گزر گئیں کئی صدیاں

جیون ایک ترنگ ہے سائیں جیون ایک ترنگ
جیسے پیاس کے صحرا میں ہو، ساون ایک ترنگ

نس نس میں جب مُرشد بولے، نس نس ایک دھمال
تن من میں جب عشق رچا ہو، تن من ایک ترنگ

رقص جہاں ہے میرا، وہ ہے، محفل ایک سرُور
عکس جہاں ہے تیرا، وہ ہے، درپن ایک ترنگ

پہلی بار تجھے دیکھا تو چھایا ایک خمار
صاحباں اور مرزے کا جیسے، بچپن ایک ترنگ

تم ہو اپنی دھن میں کھوئے، تم ہو ایک فقیر
انگ سے انگ ملا کے دیکھو، جوبن ایک ترنگ

نی مائے مجھے باندھ نہ غیر کے پلّے
میں رانجھے کی، رانجھا میرے وَلّے

یا مجھے اُس کے پاس کوئی لے جائے
یا پھر کوئی اُس کو سندیسا گھلّے

ظلم کیا ہے، کیا کھیڑوں نے مجھ پر
کب جھانکے گا اوپر والا تھلّے

میل نہیں ہے جو قسمت میں تو کیا
عاشق لوگ تو مرجاتے ہیں کلّے

بھیس بدل کے جب آئے گا رانجھا
اُس دن اپنی ہوگی بلّے بلّے

BALLEY BALLEY
Wah Wah
Riffa Makhdoom.

میں ہُوں رانجھا تخت ہزارے کا، مَیں ہوں اپنی ہیر کا نوحہ گر
جسے کھیڑے لے گئے رنگ پور، مَیں ہوں اُس اسیر کا نوحہ گر

کوئی گوشت پوست نہ تھا فقط، مری جان تھا وہ ہر اِک پرت
کہ جہاں مِلا مَیں لپٹ گیا، مَیں ہوں اُس سریر کا نوحہ گر

جو گزر گیا سو گزر گیا، کوئی تیر دل میں اُتر گیا
کہ مَیں اشکبار ہوں مستقل، غمِ ناگزیر کا نوحہ گر

تُو ہے مست اپنی ترنگ میں، میں ہوں غرق اور ہی رنگ میں
تُو بہشت کا ہے جو نغمہ گر تو مَیں زمہریر کا نوحہ گر

کوئی ذکر ہیر کا کیسے ہو کہ ظفرؔ ہیں چُپ سبھی قصہ گو
جو سکوتِ مرگ میں کھو گئی، مَیں ہوں اُس صریر کا نوحہ گر

کتنی مدّت بعد ملا تھا، اُس سے مِرا نصیبا
مار دیا مرے یار کو تُو نے، جا بے درد رقیبا

تیری نمازیں اور دعائیں، یار سے گر نہ ملائیں
چھوڑ مِسیت اور توڑ مصلاّ، بَن میں بیٹھ خطیبا

ہجر کا گھاؤ کیوں نہیں بھرتا، گھاؤ کیوں نہیں بھرتا
تیرے بس سے باہر ہے کیا، میرا حال طبیبا

جیون اُلجھا کن کانٹوں میں، اُلجھا کن کانٹوں میں
جانتا تھا تو کیوں نہیں رکھّی، میری لاج حبیبا

اِتنا رُلنے پر بھی ابتک، سُدھرا نہیں ظفرؔ تُو
چال وہی بے ڈھنگی تیری، کام ہے بے ترتیبا

رانجھنا وے جلدی آجا مر چلی مَیں رانجھنا وے
ہو کے بے بس ظالموں کے گھر چلی مَیں رانجھنا وے

پیار والی بول بولی، کر کے ہمت روک ڈولی
کوچ تیری زندگی سے کر چلی مَیں رانجھنا وے

تُو نہ آیا چیخیں سُن کے، رہ گئی مَیں سپنے بُن کے
دید والا کاسہ خُوں سے بھر چلی مَیں رانجھنا وے

بڑھتے جاتے ہیں بکھیڑے، لے نہ جائیں بیری کھیڑے
نہیں جانا چاہتی ہُوں، پر چلی مَیں رانجھنا وے

موت والی رات کالی، کوئی تو ہو میرا والی
تُو ہی آگے حوصلہ دے، ڈر چلی مَیں رانجھنا وے

ہووے اِک در بند اگر، مرا مولا سو در کھولے
دے کے نویدِ رزق مجھے، مرے پیٹ سے پتھر کھولے

کوئی نہیں ہے اُس کے سِوا، کسی غیب کے راز کا وارث
پَر جو راز کو راز رکھے، وہ راز اُسی پر کھولے

ٹھہری ہوئی ہے ایک جگہ، یہ جیون ناؤ کب سے
اُترے پانی بیچ کوئی، اور جا کے لنگر کھولے

مہکیں سارے باغ ترے اور سارے پنچھی چہکیں
میں بھی آؤں پاس ترے، صیّاد اگر پَر کھولے

جسم تھکن سے چُور ہُوا اور نیند سے بوجھل آنکھیں
سو جاتا ہوں خاک پہ ہی، اب کون یہ بستر کھولے

آن لگایا عشق نے ڈیرا، جب رانجھن آیا یاد
بھول گیا رَب مجھ کو میرا، جب رانجھن آیا یاد

نا بازار نہ جنگل دیکھا، ڈالی دھمال پھر ایسی
توڑ دیا خلقت کا گھیرا، جب رانجھن آیا یاد

ہیر سیال کی خاطر اُس نے، کیا کیا سوانگ بھرے تھے
یاد آیا جوگی کا پھیرا، جب رانجھن آیا یاد

اَن جانی چاہت کی کرنیں، من میں پھوٹیں ایسی
رات گئی اور ہُوا سویرا، جب رانجھن آیا یاد

اور قریب ظفرؔ ہوئی منزل، رستہ ہُوا اور آسان
سایہ بھی لگا اور گھنیرا، جب رانجھن آیا یاد

ہزار حشر سرِ آب تم اُٹھا رکھنا
مگر ہمارے مہینوال کو بچا رکھنا

یہ سوہنی کا تقاضا ہے اپنے شاعر سے
سخن کا ڈھب مِرے دلدار کی طرح رکھنا

جو ڈوبنا ہے مقدر تو مل کے ڈوبیں گے
خود اپنے ہاتھوں سے کچّا گھڑا بنا رکھنا

ضرور گھومنا گجرات کی فضاؤں میں
مگر یہ حُسن پیالہ کہیں چھپا رکھنا

سبب بنا یہ سَدا بیڑا پار لگنے کا
ہر امتحاں میں ظفؔر ایک ہی خدا رکھنا

نہ جاتے لے کے تجھے کاش تیرے وِیر، پُنھل
گئی ہے تیری جدائی تو سینہ چیر، پُنھل

میں سو گئی تھی تو قسمت بھی سو گئی تھی مری
کیا مجھے تو مری نیند نے اسیر، پُنھل

تری جدائی کا یا تیری بے وفائی کا
اُتر چکا ہے مرے دل میں کوئی تیر، پُنھل

مِرے نصیب میں پتھر ہیں تیری راہوں کے
تُو میرے عشق کی منزل، مَیں راہ گیر، پُنھل

خدائی اور کسی کی مجھے قبول نہیں
ہے صرف میرے لیے قادر و قدیر، پُنھل

نی مائے

ابھی تُو مجھ کو نہ ڈولی میں ڈال نی مائے
نہیں ہے کیا تجھے، میرا خیال نی مائے

سہیلیوں سے مجھے کھیلنے دے اک پل تُو
نہ مانگوں دن نہ مہینے نہ سال نی مائے

نہیں ہے اور کسی سے یہ شکوہ تجھ سے ہے
کہ جانے تُو مرے جیون کا حال نی مائے

نہ چھین مجھ سے مرے اپنے گھر کی آزادی
کہ میں ہوں پنچھی تو پردیس جال نی مائے

مرا وجود تھا بابل کے گھر پہ بھاری کیا
یہی ہے آخری تجھ سے سوال نی مائے

یہ رخصتی کا اگر فیصلہ اٹل ہے ترا
تو پھر یہ چابیاں گھر کی سنبھال نی مائے

مجھے عشق، مست توکّلی، ترے عشق سا نہیں چاہیے
کسی دوسرے کے سہاگ میں، کبھی جھانکنا نہیں چاہیے

تری بے خودی بھی فریب ہے، تری عاشقی بھی فریب ہے
کسی ڈولتے ہوئے جسم کو ، ترا آسرا نہیں چاہیے

ہیں عجیب عشق کی منزلیں کہ جو ہر کسی کو نہیں ملیں
جہاں ایک ہو کوئی ہم سفر، وہاں دوسرا نہیں چاہیے

ہیں عجیب دل کے معاملے، کبھی قربتیں کبھی فاصلے
جہاں دو دلوں میں ہوں رغبتیں، وہاں تیسرا نہیں چاہیے

کوئی سمّوں جیسی نہیں ملی، وہ کلی دوبارہ نہیں کھلی
کسی اور کی ہو جو زندگی، اُسے ڈھونڈنا نہیں چاہیے

حاضر ہے میرے دل کا کنول یار کے لیے
کھلتا ہو چاہے ایک ہی پل یار کے لیے

یہ اعتکاف چھوڑ، کسی روز شہر میں
کرتا ہوا تُو رقص نکل یار کے لیے

کیا جانے کس گھڑی کرے اشنان، اُس کی یاد
اُجلا ہی رکھنا من کا یہ جل یار کے لیے

ممکن تھا کوئی اور گھروندا بناتا میں
بنتا اگر نہ تاج محل یار کے لیے

اِک ہوک میرے دل سے بھی اُٹھے اسی طرح
بے تاب جس طرح تھا پنُھل یار کے لیے

مجھ کو تو اپنے آپ سے کوئی غرض نہیں
جیون ہو میرا کاش سپھل یار کے لیے

پیلو بھی اس نواح میں پکیاں زیادہ ہیں
شاداب ہو رہا ہے یہ تھل یار کے لیے

کیا میں بتاؤں دھیان کے سر سبز کھیت میں
بے کل تھی کون کون سی وَل یار کے لیے

آتے ہیں آج کل وہ نظر یار کے قریب
کہتے رہے ظفرؔ جو ہزل یار کے لیے

☆

ہو نہ سکا آج تک، ہم سے تو قائل وہی
اُس کے تقاضے نئے، اپنے وسائل وہی

اُس کے بھی دوارے پھرے، دن نہ ہمارے پھرے
در بدری ہے وہی، کاسۂ سائل وہی

آج بھی باقی ہے وہ، پہلے رقابت جو تھی
اُس کے مِرے درمیاں، لوگ ہیں حائل وہی

اُس کا مِرا اختلاف، ختم ہو کیسے ظفرؔ
اُس کی شکایات اور، میرے دلائل وہی

Soooper

Nice

Ooooo
JEE OYE!

زندگی رانجھے کی، کھوئی ہوئی اک عہدِ فراموش میں تھی
اور کیا ہیر سے شکوہ کہ وہ ڈولی میں کہاں ہوش میں تھی

آخرش پالیا سہتی کی محبت نے بلوچوں کا مراد
اوّلیں عشق میں چڑھتی ہوئی ندّی کی طرح جوش میں تھی

سوہنی یہ، نہ مہینوال تھا وہ، اور نہ وہ عشق کی لہر
دیکھنے میں تو کمی کوئی صبیحہ میں نہ سنتوش میں تھی

خاک میں ملتا ہُوا لگتا تھا بِن پنّوں کے سسّی کا بھنبھور
یعنی ساری تپشِ عشق نہاں شامِ سیہ پوش میں تھی

حسنِ اندوختہ پر ثبت کیا اُس نے ظفرؔ بوسۂ عشق
صاحباںؔ، ہیر بہوٹی کی طرح، مرزا کی آغوش میں تھی

جانے نہیں دیتا ہے مجھ کو، تیری اور کوئی
یوں لگتا ہے توڑ رہا ہے، سانس کی ڈور کوئی

میں نے دلبر کو لکھ بھیجی، آج اُس کی تفصیل
کرتا تھا جو چاند سے باتیں رات چکور کوئی

پھر بھی شناسائی کی میں نے، ڈھونڈ لی ایک سبیل
پاس نہیں تھا میرؔ کی صورت، زر اور زور کوئی

رات کی چُپ میں مرتا لیکن تب جی اُٹھتا جب
مجھ سے پہلے مرنے والا کرتا شور کوئی

کر کے یاد ظفرؔ روتا ہوں، ایسے ماضی کو
دیکھ کے اپنے پاؤں کو جیسے روئے مور کوئی

تال کا پانی ٹھہرا ٹھہرا، گم صم سبھی ممولے
چلا گیا ہے جانے والا، گھاٹ پہ بیٹھ کے رو لے

میں ہوں اور وچھوڑے کا ہے، تازہ تازہ صدمہ
اور ہو گہرا صدمہ جس دم کالا تیتر بولے

کھیت اُجاڑ کے تیرے تن کا، چلتا بنا ہے کوئی
پھر بھی نیند اگر آتی ہے، سرسوں اوڑھ کے سو لے

بس کے اڈّے پر وہ ناری، آج اچانک دیکھی
سُوکھ کے ہو گئی کانٹے جیسی، ہاتھ لگے تو ڈولے

کیسا برات کا شور شرابا، کیا شادی کی رسمیں
ٹوٹ گئی ہے کانچ کی گڑیا، بکھر گئے ہیں پٹولے

تاب نہ تب بال و پر میں اور پرندہ
خوف نمایاں سفر میں اور پرندہ

ایک پرندہ ابھی اُڑان میں انجان
اُس کو رکھّے گا نظر میں اور پرندہ

جو بھی تنا کھوکھلا ہے سانپوں کا گھر ہے
موت کا ساماں شجر میں اور پرندہ

تیر کماں کی طرح ہیں پیڑ کی شاخیں
خون رواں چشمِ تر میں اور پرندہ

کس کی ظفرؔ ہے مجال، مار سکے پَر
ایک خلا رہ گزر میں اور پرندہ

جشنِ وصال کی لاکھ سبیلیں اور سنجوگ ہزار
ایک مجھے بس تُو نہیں ملتا، ویسے لوگ ہزار

تیرے دھیان کی دیوالی میں، ہر دم رقص کروں
چھوڑ کے اس نگری کو چاہے لے لوں جوگ ہزار

حُسن کی رغبت سے بھی زیادہ طاقت عشق میں ہے
جی نہیں بھرتا میرا چاہے کرلوں بھوگ ہزار

اگر یہاں مِرا یار نہ ہو تو رہُوں یہاں مَیں کیوں
ساتھ مگر نہیں رہتا چاہے کروں مَیں سوگ ہزار

بھیس بدل کے جوگی والا، گاتا پھرے ظفؔر
عشق میں روگ ہزار او سائیں عشق میں روگ ہزار

حد سے بڑھنے لگا ظلم کا سلسلہ، دل نہیں لگ رہا
اُس نے احوال پوچھا تو مَیں نے کہا، دل نہیں لگ رہا

شہر میں تو مِرے جتنے بھی یار ہیں سب گرفتار ہیں
کس کو معلوم ہے کون ہو کب رہا، دل نہیں لگ رہا

میں بھی پابند ہوں وہ بھی پابند ہیں راستے بند ہیں
اب تو ممکن نہیں ہے کوئی رابطہ، دل نہیں لگ رہا

کیسا ہنگام ہے کوئی آغاز ہے اور نہ انجام ہے
جانبِ قتل گہہ دھیان ہے اب مِرا، دل نہیں لگ رہا

سُرخ ہو جائیں گے جب مِرے خون سے پانچ دریا ظفؔر
پھر کہے گی مری طرح خلقِ خدا، دل نہیں لگ رہا

نوکِ پاپوش پہ رکھتا ہوں مَیں تجھ کو ترے دربار سمیت
سر اُٹھائے گا جو نخوت سے تو گر جائے گا دستار سمیت

یہ جو مظلوم ہیں، اتنا بھی نہ کمزور سمجھ تُو ان کو
یہ ترا تخت جلا ڈالیں گے اِک دن ترے گھر بار سمیت

جس کے اکسانے پہ اس درجہ ستم تُو نے روا رکھّا ہے
قتل کر دیں گے تجھے لوگ اُسی حاشیہ بردار سمیت

اپنی موت آپ ہی مر جائے گا تُو، نام بھی لے گا نہ کوئی
ختم ہو جائے گا ہر ذکر ترے ظلم کے پرچار سمیت

گھر کی ویرانی کو اکثر سرِ بازار لیے پھرتا تھا
آج بازار کو لے آیا ہوں گھر، رونقِ بازار سمیت

میرا اِک پل کا تغافل کبھی اک آنکھ نہ بھاتا تھا تجھے
اب حوالے ترے کرتا ہوں مَیں دل عشق کے آزار سمیت

شکریہ تیرا ادا کرنے کا موقع مجھے ملتا کیسے
تُو نے تو سایۂ دیوار عطا کر دیا دیوار سمیت

حکمرانوں کی حمایت بھی تجھے مہنگی پڑے گی صابر
تجھے اِک روز نظر بند کریں گے ترے اخبار سمیت

تغیّر کی صدا آوے ہی آوے
ہمارا ہم نوا آوے ہی آوے

نہیں چلنے کا بندوں سے یہ کھٹ راگ
زمیں پر اب خدا آوے ہی آوے

یہ سب گلیاں ہیں اپنی دیکھی بھالی
نظر وہ دل ربا آوے ہی آوے

گزرنے کو ہے اب موسم گھٹن کا
سو اب تازہ ہوا آوے ہی آوے

بدلتی جارہی ہیں ساری قدریں
پرانوں میں نیا آوے ہی آوے

جو منزل کی طرف لے جائے سب کو
اِدھر وہ قافلہ آوے ہی آوے

اگر اک آ نہیں پایا تو کوئی
مسافر دوسرا آوے ہی آوے

نہیں ممکن اگرچہ اُس کا آنا
مگر تم دیکھنا آوے ہی آوے

جسے آنا ہے وہ آ کر رہے گا
ظفرؔ نعرہ لگا آوے ہی آوے

☆

خبر ہے گرم کہ ہے آج میرے قتل کی رات
کہاں گئے مِرے بازو کہاں گئے مِرے ہاتھ

لگی ہے ضرب تو یوں کانپ اُٹھا ہوں مَیں جیسے
اُلجھ پڑی ہو خود اپنی ہی ذات سے مری ذات

اُٹھا رہے ہیں فصیلیں جو دوسروں کے لیے
عجب نہیں کہ اُنہیں بھی ملے نہ راہِ نجات

ہجومِ غم میں ظفرؔ آ گئی ہے یہ نوبت
نہ ضبط ہو سکے مجھ سے نہ کر سکوں کوئی بات

تنہائی فریب دے رہی ہے
پہلا مَیں ہوں کہ دوسرا مَیں

☆

گروہِ عاشقاں پکڑا گیا ہے
جو نامہ بر رہے ہیں ڈر رہے ہیں

☆

میں نے اوڑھی ہے ترے پیار کی اجرک ایسی
اب تجھے چھوڑ کے پنجاب نہیں جا سکتا

☆

میں رو دیا کہ مجھے یاد آئیں شدت سے
کبھی کبھی تری مجبوریاں کبھی کبھی تو

☆

جسے ملنا ہے خود آئے گا اور آکر ملے گا
طوافِ کوچۂ جاناں فقط آوارگی ہے

☆

سنا ہے اِن دنوں ہم رنگ ہیں بہار اور آگ
یہ آگ پھول ہو، مَیں نے بہت دُعا کی تھی

☆

خدا کرے وہی پہچان ہو ہماری ظفرؔ
وہ ایک شعر کہ جس پر ہمارا نام نہ ہو

شادمانی، شادمانی، تم پکارو، شادمانی ہے کہاں
زندگانی کی ہوس میں جی رہا ہوں، زندگانی ہے کہاں

پیاس میری جس کی لہروں سے بجھانے کے ہیں دعوے اِس قدر
وہ محبت کا ہے دریا، لیکن اب دریا میں پانی ہے کہاں

ان دریچوں میں وہ صورت ہی نہیں ہے ڈھونڈتا ہوں مَیں جسے
خوش نما پوشاک میں ہر جسم بے جاں ہے، جوانی ہے کہاں

چاہنے والا مَیں جس کا تھا وہ میرا چاہنے والا گیا
نقشِ اوّل ہی نہیں تو کیا مَیں پوچھوں نقشِ ثانی ہے کہاں

آنے والی لہر سے مایوس تو ہرگز نہیں صابر ظفؔر
آنے والی لہر کی لیکن یہاں کوئی نشانی ہے کہاں

شیشے کا گھر نہیں رہے گا
یا پھر پتھر نہیں رہے گا

یا گر جائیں گی سب فصیلیں
یا کوئی دَر نہیں رہے گا

یا اُڑ جائیں گے سارے پنچھی
یا کوئی پَر نہیں رہے گا

یا بجھ جائیں گی اپنی آنکھیں
یا یہ منظر نہیں رہے گا

یا ہوں گے سر بلند صابرؔ
یا کوئی سر نہیں رہے گا

روز و شب جو بھی ملے ہم کو، نرالے ہی ملے
نہ کٹی رات ستم کی، نہ اُجالے ہی ملے

تیرے میخانے کے چرچے تھے بہت لوگوں میں
ہم جو پہنچے تو ہمیں خالی پیالے ہی ملے

تیری تاریخ نے جن جن کو بھی زندہ لکھا
خود ملے وہ نہ ہمیں اُن کے حوالے ہی ملے

ہم ہی آواز اُٹھاتے رہے ظالم کے خلاف
تیرے ہونٹوں پہ تو خود ساختہ تالے ہی ملے

یہ وطن ایسا شجر ہے کہ ظفرؔ جس کو یہاں
بیشتر لوگ جڑیں کاٹنے والے ہی ملے

وہ دریا جو اُبھارے جا رہے ہیں
سمندر میں اُتارے جا رہے ہیں

گئے ہوں گے ترے بھی لوگ لیکن
وہ ساتھی جو ہمارے جا رہے ہیں

نہیں ہے کوئی منزل جب ہماری
تو پھر ہم کس کنارے جا رہے ہیں

نہیں جب کوئی تنکے کا سہارا
تو پھر کس کے سہارے جا رہے ہیں

اُدھر ہے کاغذی میرا نشیمن
جدھر اُڑ کر شرارے جا رہے ہیں

نجانے عشق کا آغاز کب ہو
ابھی تو دل سدھارے جا رہے ہیں

یہاں رہ کر اکیلے کیا کرو گے
چلو تم بھی کہ سارے جا رہے ہیں

نجانے درمیاں ہے تیسرا کون
مرے دشمن بھی مارے جا رہے ہیں

نجانے کیا ہو اس گنتی کا حاصل
یہ ہم جو دن شمارے جا رہے ہیں

ظفرؔ سنتا نہیں ہے جو ہماری
اسی کو ہم پکارے جا رہے ہیں

☆

Gud!

اے تماشائیو، کیا تماشا نہیں ہو رہا
کون سا شخص ہے جو کہ رُسوا نہیں ہو رہا

کس ستم کی نہیں مل رہی ہے ستم گر کو داد
کون سا حشر ہے جو کہ برپا نہیں ہو رہا

میں تمہاری عنایت سے ایسا نظر بند ہوں
ایک مدت سے گھر سے نکلنا نہیں ہو رہا

شامِ غم کی سحر واقعی ہو گئی کیا ظفرؔ
دیکھنے میں تو کوئی اجالا نہیں ہو رہا

اک نئے حوصلے کے ساتھ، صبح کی آس میں رہو
رات گزر رہی جائے گی، ہوش و حواس میں رہو

کیسے کٹے گا یہ سفر، آئے گا کیا ہدف نظر
راہ میں اس طرح نہ تم، خوف و ہراس میں رہو

غیر سے مانگا پیرہن، ایسا ہے جیسے ہو کفن
چاہے لباسِ خاک ہو، اپنے لباس میں رہو

اہلِ یقیں کو چھوڑ کر، پھرنا پڑا ہے دربدر
میں نے کہا نہ تھا کہ مت اہلِ قیاس میں رہو

کیا ہے وجود کیا عدم، آگے بڑھاؤ تم قدم
راہِ غرور میں نہیں، راہِ سپاس میں رہو

چاہے وہ غم ہو دہر کا، چاہے وہ غم ہو یار کا
غم ہے اساسِ زندگی، غم کی اساس میں رہو

چاہو جو منزلِ مراد، مانگو نہ ہر کسی سے داد
جی میں جو آئے وہ لکھو، حلقۂ خاص میں رہو

کوئی ملال ہے تو کیا، جسم نڈھال ہے تو کیا
تھامو ظفرؔ کو بھی ذرا، خود بھی حواس میں رہو

Think about this reality.

فکر کرنے ہی سے ملتی ہے سخن کی دولت
جو نہیں سوچتا خوش حال نہیں ہو سکتا

لکھنے والا جو اُسے اپنے لہو سے لکھّے
کوئی مضمون بھی پامال نہیں ہو سکتا

☆

دنیا نے بند کر دیے جب سارے راستے
اک سلسلہ خیال کا دلبر سے جا مِلا

کیا ہو گلہ ظفرؔ کسی ایماں فروش سے
جب وہ خدا پرست بھی کافر سے جا مِلا

☆

دکھ دیدنی تھا صرفِ نظر ہو کے رہ گیا
اب سانحہ بھی صرف خبر ہو کے رہ گیا

اُس کے شعار پر نہ کسی کی نظر گئی
اپنا تو کارِ خیر بھی شر ہو کے رہ گیا

ہجرت کرو یہاں سے درِ یار کی طرف
یہ گھر تو ایک راہ گزر ہو کے رہ گیا

ہمارا عشق ظفرؔ رہ گیا دھرے کا دھرا
کرایہ دار اچانک مکان چھوڑ گیا

☆

سیمِ اجل میں خسِ زیست کی طرح صابرؔ
بہا دیا گیا ایسا کہ بے نشان ہوا

☆

صابرؔ کسی سے دھوپ کی شدت کا کیا گلہ
دیوار ہی نہیں ہے تو سایا کہاں سے آئے

☆

بس اتنا یاد ہے کچھ لوگ بک رہے تھے ظفرؔ
خبر نہیں کہ وہ مہنگے تھے یا کہ سستے تھے

☆

اندھیری رات میں آنسو چمک رہے ہیں ظفرؔ
ہوا بجھائے گی کیا، گھر میں تو دیا ہی نہیں

☆

صابرؔ اُس کی آوازوں کے ساتھ کہاں تک جاؤ گے
وہ تو گہری خاموشی ہے وہ تو اِک سناٹا ہے

اُچھالنا ہے لہو، سر بلند ہونا ہے
نیاز مند نہیں، فتح مند ہونا ہے

مِری وفا کا خریدار کوئی ہو کہ نہ ہو
مگر یہ ظلم کا بازار بند ہونا ہے

میں ہو رہا ہوں طلوع، آفتاب کی صورت
غرض نہیں مجھے کس کی پسند ہونا ہے

مِرے غموں کی نہیں ہے تجھے خبر تو نہ ہو
مگر مجھے تو ترا دردمند ہونا ہے

سلوکِ یار سے ناخوش نہیں ہوں پھر بھی ظفرؔ
اگرچہ میرے دکھوں کو دو چند ہونا ہے

درخت کاٹ کے سایا فروخت کرتے ہیں
اور اُس کے بعد کڑی دھوپ سے گزرتے ہیں

کریدتے ہیں خود اپنے گھروں کی بنیادیں
اور اُس کے بعد کہیں اور جا ٹھہرتے ہیں

ہمیں خود اپنے مسائل پہ غور کرنا ہے
کہ روز روز صحیفے نہیں اترتے ہیں

ستم سہے ہیں بہت ہم نے تیرے لوگوں کے
سو دیکھتے ہیں تجھے اور آہ بھرتے ہیں

تری پناہ میں آتے ہیں بے اماں ہیں جو لوگ
جو خود کو زندہ سمجھتے ہیں تجھ پہ مرتے ہیں

ظفرؔ جو لوگ ہوں اونچی اُڑان سے خائف
وہی ہمیشہ پرندوں کے پَر کترتے ہیں

نئی غزل کے لیے راستے نکلنے دیں
خیال دل میں ہیں جو سر پھرے نکلنے دیں

اُلٹ کے دیکھنے دیں خاکِ ہست و بود کو ہم
اور اِس زمیں سے خزانے نئے نکلنے دیں

قریب آنے میں اک دوسرے کے، دیر نہ ہو
ہم اپنے دل سے اگر وسوسے نکلنے دیں

اُچھالیں ہم بھی کوئی سرخوشی کی لہر، اگر
گرفتِ غم سے ہمیں، سانحے نکلنے دیں

چلو خود اپنی غزل سے نکالیں فالِ ظفرؔ
اگر نکلتے ہیں کچھ واہمے نکلنے دیں

تجھ بِن اب شام ہو گئی ہے
اور عمر تمام ہو گئی ہے

آیا نہیں خواب میں بھی کوئی
اور نیند حرام ہو گئی ہے

آغاز ہی میں تری جدائی
میرا انجام ہو گئی ہے

کیا تجھ سے گلہ کہ اب گھمنڈی
ہر گُل اندام ہو گئی ہے

اک تیرے سلوکِ ناروا سے
کیا شکلِ عوام ہو گئی ہے

حیراں ہوں کہ وصل کی وضاحت
واضح ابہام ہو گئی ہے

کیا ہو گئی طبعِ پیشوا شانت
بولے خدّام ہو گئی ہے

دو لخت تھا دل مگر تری چاہ
وجہِ ادغام ہو گئی ہے

ہونے سے ترے، ازل ابد ہیچ
ہستی بسرام ہوگئی ہے

کاش اہلِ حکومت اُس کو کَس لیں
ڈھیلی جو زمام ہوگئی ہے

یہ چار دنوں کی زندگانی
نذرِ اصنام ہوگئی ہے

اسلام ہے کیا مگر یہاں کیا
شکلِ اسلام ہوگئی ہے

چاہت تھی کبھی جو بیش قیمت
کھوٹی وہ چھدام ہوگئی ہے

کھولو کوئی دَر خیالِ نو کا
بے فکری تو دام ہوگئی ہے

سنتے ہی کلام جان میری
ہم رنگِ کلام ہوگئی ہے

کرنا نہ پڑی کوئی پرستش
وہ آپ ہی رام ہوگئی ہے

لگتا ہے کہ تجھ سے میری نسبت
فطرت کا نظام ہو گئی ہے

ہم قتل کے بھی رہے نہ لائق
وہ تیغ نیام ہو گئی ہے

افسوس کہ تشنگی کی حرمت
مے خوار کا جام ہو گئی ہے

تمغوں کی رہی نہ کوئی توقیر
خیرات انعام ہو گئی ہے

خلقت کا دُکھا کے دل، حکومت
خاصی بدنام ہو گئی ہے

کرتی تھی جو دل پہ حکمرانی
دھڑکن وہ غلام ہو گئی ہے

آسائشِ زندگی نہ پوچھو
وقفِ آلام ہو گئی ہے

تھی اشک فشاں جو چشم پہلے
اب خوں آشام ہو گئی ہے

تیرے لیے عمر جو گزاری
وہ عمر دوام ہو گئی ہے

ڈھانچہ ہے بشر کا صرف باقی
عزت نیلام ہو گئی ہے

باقی تھی رمق جو زندگی میں
وہ بھی ترے نام ہو گئی ہے

پہلے سرِ راہ تھی ملاقات
اب تو سرِ بام ہو گئی ہے

رُسوائی کہیں کہیں تھی پہلے
اب تو سرِ عام ہو گئی ہے

پہلے تو یہ رہزنی تھی کم کم
اب تو ہر گام ہو گئی ہے

بیمار کو وہم ہے کہ پیدا
شکلِ آرام ہو گئی ہے

افسوس کہ یہ جماعتِ دہر
آپ اپنی امام ہو گئی ہے

لگتا ہے ظفرؔ یہ شاعری بھی
جزوِ الہام ہوگئی ہے

☆

☆

غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی مانند
بچھڑ کے اُس نے طبیعت اُداس کردی ہے

لہو رلا بھی گئی ہے وہ دل کی کیفیت
ہنسی ہنسی میں جو ہم نے بیان کردی ہے

قدم اُٹھاؤں تو میرے قدم نہیں اُٹھتے
یہ کیسی تُو نے مجھے مہلتِ سفر دی ہے

وہ عمر جس میں ہمیں خود سے ملنا جلنا تھا
وہ عمر صرف تری جستجو میں کردی ہے

نصیب کیا ہو سحر، تیرگی کے ساتھ ہیں ہم
اُسی نے قتل کیا ہے اُسی کے ساتھ ہیں ہم

رواں دواں ہیں یونہی گردنیں جھکائے ہوئے
مگر خبر نہیں، کس آدمی کے ساتھ ہیں ہم

کسی کو دوش نہ دیں اس لیے بھٹکنے کا
کہ شاید اپنی ہی آوارگی کے ساتھ ہیں ہم

کچُل رہا ہے ہماری انا کوئی پھر بھی
شریکِ بزم بڑی عاجزی کے ساتھ ہیں ہم

یہ زندگی تو کوئی زندگی نہیں ہے ظفرؔ
اگرچہ کہنے کو تو زندگی کے ساتھ ہیں ہم

پڑا نہ فرق کوئی پیرہن بدل کے بھی
لہو لہو ہی رہا جم کے بھی پگھل کے بھی

بدن نے چھوڑ دیا روح نے رہا نہ کیا
میں قید ہی میں رہا قید سے نکل کے بھی

☆

ظلم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے آپ
اور قبیلہ مِرا ایسا ہے کہ لڑتا بھی نہیں

سلسلہ جاری ہے تعمیر و خرابی کا ابھی
شہر بستا بھی نہیں اور اُجڑتا بھی نہیں

☆

اگر نذرِ زمیں ہوں گے یونہی اُجلے رہیں گے ہم
شہیدِ عشق کا ملبوس ہیں دھونا نہیں ہم کو

ظفرؔ ہم زندگی ہیں، زندگی اِک بار ملتی ہے
اگر مل جائیں ہم تم کو تو پھر کھونا نہیں ہم کو

Nice
Nice
Nice one
WAH!

لٹنے دو ارمانوں کی سب نقدی، مال سمیت دکاں دے دو
سسک سسک کر مرنے سے بہتر ہے، ایک ہی بار یہ جاں دے دو

سچ کی خوشبو جن کی باتوں میں ہے، بولو اُن کے لہجے میں
پہرہ لگا ہوا ہے جن کی زباں پر، اُن کو اپنی زباں دے دو

دیواریں آکاش تلک حائل ہیں، کیسے تم تک پہنچیں گے
جن کا رستہ روکا گیا ہے اُن کو اپنا کوئی نشاں دے دو

دودھ کی نہر بہا دیں گے اک دن یہ پربت کاٹنے والے لوگ
ساتھ اگر چلنے میں دشواری ہے ان کے حق میں بیاں دے دو

ظفرؔ تمہارے دوست بہت ہی جلد تمہارا حق دلوائیں گے
اپنی جنگ نہیں لڑسکتے تم تو ان کو تیر و کماں دے دو

چھوڑیں ظالم کسی ہاری کے نہ کچھ بھی پلے
جانے کس روز مریں گے یہ وڈیرے دلے

راستہ دار کو جاتا ہے چلو تم بھی چلو
تم نہ جاؤ گے تو جائیں گے ہمی پھر کلے

امتحان کی ہے گھڑی، جان کسی پر وارو
جان وارو گے تو ہوجائے گی بلّے بلّے

نسلِ آدم کے نہ بڑھنے کی شکایت کیسی
سارے رحموں پہ چڑھا رکھے ہیں تم نے چھلّے

حکمرانوں سے بہت تنگ ہے خلقت صابرؔ
تم کو فرصت ہو تو دوچار دو تم بھی کھلّے

محبت ہو نہیں پائی محبت ہو بھی سکتی تھی
یہ دل دیوانہ بن جاتا تو قربت ہو بھی سکتی تھی

میں تیرے دھیان کی شمعیں اگر رکھتا نہ ساتھ اپنے
تو اُس بارہ دری میں شام غارت ہو بھی سکتی تھی

جہاں تالاب تھے اور حوض میں پریاں نہاتی تھیں
وہ جنّت تو نہیں تھی ویسے جنّت ہو بھی سکتی تھی

میں جاتا تھا اُسی کی سمت سنگل توڑ کر سارے
مِری دیوانگی کی یہ علامت ہو بھی سکتی تھی

کسی مٹیار کا سنجوگ غیروں سے تھا نا ممکن
کہ یہ اُس کے قبیلے کی روایت ہو بھی سکتی تھی

میں ہارا اس لیے تھا میں نے تجھ پر فیصلہ چھوڑا
مِری منصف مِرے دل کی عدالت ہو بھی سکتی تھی

ترنجن میں تجھے تکنے زمیں پر چاند اُتر آیا
کہ مجھ ناچیز سے اُس کو رقابت ہو بھی سکتی تھی

اُدھوری سی جو لڑکی تھی اُسے آخر یقین آیا
مجھے پا کر مکمل ایک عورت ہو بھی سکتی تھی

میں ٹوٹی سیڑھیوں میں مضطرب تھا اور وہ چھت پر
کبھی تنہائی میں پیدا یہ صورت ہو بھی سکتی تھی

بچھڑ کے زہر کھالوں گی، کنویں میں گر کے جاں دوں گی
بظاہر ایک دھمکی تھی، حقیقت ہو بھی سکتی تھی

دریچے میں اُجالا اُس کے ہونے کا حوالہ تھا
وگرنہ رات کی تقدیر، ظلمت ہو بھی سکتی تھی

محل سے بھاگنا اور جھونپڑی میں آ کے رُک جانا
اگر مجبور کرتا دل، یہ ہجرت ہو بھی سکتی تھی

وہ راضی ہی نہیں تھا دھڑکنوں کے ساتھ چلنے پر
وگرنہ دل سے دل تک طے مسافت ہو بھی سکتی تھی

نہ تھی قوموں سے دلچسپی مگر ہائے وہ کشمیرن
مِرے جیون کا حاصل جس کی سیرت ہو بھی سکتی تھی

چُرا لیتا نہ دل میرا اگر وہ سانولا مکھڑا
جدھر سب تھے اُدھر مائل طبیعت ہو بھی سکتی تھی

پرانی داستانوں کا بیاں چوپال کے اندر
وہاں اپنی کتھا کہنے کی جرأت ہو بھی سکتی تھی

زلیخا دامنِ یوسف سے لپٹی رو رہی ہوگی
کہ اک مجبور دل کی کوئی قیمت ہو بھی سکتی تھی

مسائل اور تھے میرے مگر لکھتا رہا کچھ اور
میں غافل تو نہیں تھا ویسے غفلت ہو بھی سکتی تھی

میں سب کے ساتھ رہتا تھا اسی باعث تھا سب جیسا
مگر حاصل مجھے سب پر فضیلت ہو بھی سکتی تھی

مجھے خواہش نہیں ہے محفلوں میں داد پانے کی
مخاطب یار ہوتا تو یہ حسرت ہو بھی سکتی تھی

مجھے پروا نہیں لیکن ترا کہنا ہو سچ شاید
مری شہرت میں حائل میری غربت ہو بھی سکتی تھی

تڑختی ٹوٹتی سنجیدگی سے عمر جو گزری
وہ اِک معصوم بچّے کی شرارت ہو بھی سکتی تھی

غزل کی اس فضا سے اختلافِ رائے ممکن تھا
مگر اک آپ بیتی کی حمایت ہو بھی سکتی تھی

اکیلا ہو گیا ہوں مَیں کہ مجھ جیسا نہیں کوئی
کوئی مجھ جیسا ہوتا تو رفاقت ہو بھی سکتی تھی

کلی مرجھا چکی ہو گی، جو اب سونی حویلی میں
اُسے صابر ظفر سے کوئی نسبت ہو بھی سکتی تھی

☆

آنکھیں بھی نہیں جھپک رہا ہے
یہ کون بغور تک رہا ہے

حیرت ہے وہ برف برف لہجہ
شعلے کی طرح دہک رہا ہے

تُو جانے کہاں ہے لیکن اک شخص
اب تک تری راہ تک رہا ہے

یادوں میں بسا ہے کون گُل رُخ
خوشبو سے بدن مہک رہا ہے

دکھا کے اپنے حُسن کی ادا عجب عجب طرح
وہ رات مجھ پہ مہرباں ہُوا، عجب عجب طرح

وہ پہلا پہلا تجربہ تھا عشق میں وصال کا
چلی جو سسکیوں بھری ہَوا، عجب عجب طرح

برہنگی میں جسم پر تھی اک قبائے تیرگی
قبا کا بند بند پھر کُھلا، عجب عجب طرح

تمام شب گواہ تھی، شکن شکن لباس کی
وہ درد سے بکھر بکھر گیا، عجب عجب طرح

اُسی کا یہ شعار تھا، اسی کو اختیار تھا
بدن سے میری روح کھینچنا عجب عجب طرح

ہم ایک دوسرے کے سنگ سنگ بھیگتے رہے
اُٹھایا لطف بوند بوند کا عجب عجب طرح

خرام میں تھا اُس کے آمدِ بہار کا غرور
کہ مہکا باغ اِک سرور کا عجب عجب طرح

مسہریوں سے دُور دونوں یُوں زمیں پہ سو گئے
کہ آسمان رشک سے جُھکا، عجب عجب طرح

بس ایک بار اُس نے اپنے پاس کیا بُلا لیا
لکھا وہ مَیں نے ایک واقعہ، عجب عجب طرح

مِری ضرورت ایک سے زیادہ محفلیں رہیں
سو میں نے پُر کیا تھا یہ خلا، عجب عجب طرح

قریب ایک مورتی کے مَیں جو رات سو گیا
کھلا عقیدہ میرے عشق کا، عجب عجب طرح

بدن سے اُس کے چھ ... رات کو
گماں ہوا طلوعِ ... طرح

نہیں تھا یاد رنگ و ... نا یاد ہے
چمک رہی تھی ہاتھ پر حِنا، عجب عجب طرح

گزارنا پڑی تھی رات اک پلیٹ فارم پر
کِیا وہاں بھی ہم نے رت جگا، عجب عجب طرح

وہ رنگ رنگ تتلیاں مجھے بہت پسند تھیں
ہُوا مَیں اُن کے عشق میں فنا، عجب عجب طرح

فریم سے نکل کے دیوی آ لگے مرے گلے
خدا سے مَیں نے کی یہ التجا، عجب عجب طرح

سمجھ رہا تھا مَیں کہ وہ بہت کٹھور ہے مگر
شباب سے عیاں ہوئی حیا، عجب عجب طرح

نہ تھی مجال اُس کی، وہ گرفت سے نکل سکے
بچھایا جال مَیں نے چاہ کا، عجب عجب طرح

اُسی کے حُسن کا وجود تھا اُفق کے پار بھی
کہ آفتابِ عشق ادھر گیا، عجب عجب طرح

عجب طرح کا مشغلہ تھا اُس کا راہِ عشق میں
بکھیر کر مجھے سمیٹنا، عجب عجب طرح

سلوک میں تپاک کا طلسم بے پناہ تھا
کہ ٹپکا رس کوئی نباہ کا، عجب عجب طرح

مرے وجود سے لپٹتے ہی سلگ سلگ اُٹھا
وہ حسن ہجر میں بجھا ہُوا، عجب عجب طرح

لگاتا گھاؤ وہ نئے نئے مگر کبھی کبھی
پرانے زخم بھی کریدتا، عجب عجب طرح

کوئی تو بات تھی کہ بے سبب نہ تھا مِرے لیے
وہ اُس کا اپنے گھر سے بھاگنا، عجب عجب طرح

ہم ایسی ستر پوشیوں سے بے لباس ہی بھلے
دریدہ ہو کے رہ گئی انا، عجب عجب طرح

سرشت میں تھا جس کے ٹوٹنا وہ میرے عشق میں
لچکتی شاخ کی طرح جھکا، عجب عجب طرح

نقاب اُٹھ گئے سبھی، حجاب اُٹھ گئے سبھی
یہ مرحلہ کٹھن بھی طے ہُوا، عجب عجب طرح

اگن تھی خیمہ گاہ میں سہاگ کے الاؤ کی
کہ جس سے دشت سارا جل اُٹھا، عجب عجب طرح

ہمیشہ دربدر پھرا کہ اِک خیال کا سِرا
میں ساری عمر ڈھونڈتا رہا، عجب عجب طرح

ہم ایک دوسرے کو دیکھتے تھے جس کے سامنے
ہُوا وہ چُور چُور آئنہ، عجب عجب طرح

رہا نہ یاد جس کا ذائقہ، وہ سوڑگ کا ثمر
ہزار مرتبہ اُسے چکھا، عجب عجب طرح

مجھے ہیں یاد ساری کروٹیں وصال و ہجر کی
کبھی ملا کبھی ہُوا جُدا، عجب عجب طرح

وہ کیسے کیسے مضطرب رہا مرے فراق میں
سنایا اُس نے سارا ماجرا، عجب عجب طرح

کتاب تھا ورق ورق الگ الگ کیا گیا
گلاب تھا مسل دیا گیا، عجب عجب طرح

مگر نہیں ہے یاد کس کنارے کس گھڑی لگا
میں آبجوئے حسن میں بہا، عجب عجب طرح

شفق کے رنگ میں وہ کیوں نہ ڈوبتا مرے لیے
کہ میں نے کی تھی وصل کی دُعا عجب عجب طرح

نہیں تھا موجۂ ہوا تو کون تھا وہ باغ میں
جو ہر کلی کو چھیڑتا رہا، عجب عجب طرح

وہ پا بہ پا قریب تھا، وہ لب بہ لب نصیب تھا
نشہ چڑھا اُسے شباب کا، عجب عجب طرح

شراب کا وہ جام تھا کہ جس میں مثلِ ماہتاب
میں ساری رات ڈوبتا رہا، عجب عجب طرح

بلادکار ہوگیا تو ظلم ہوگیا، مگر
عبث ہے بار بار تذکرہ، عجب عجب طرح

ابد کی شاخ پر خزاں، ازل کی شاخ پر بہار
وہ شاخ شاخ جھولتا رہا، عجب عجب طرح

نہ کوئی ڈر شروع کا، نہ کوئی خوف انت کا
وہ رات زیبِ داستاں ہُوا، عجب عجب طرح

سفید کیا سیاہ کیا کہ عشق میں گناہ کیا
ہر ایک رنگ میرا ہو گیا، عجب عجب طرح

پہنچ گیا تھا رات میں تو اُس کی بزمِ خاص میں
جلا ہُوا کبھی بجھا ہُوا، عجب عجب طرح

حویلیاں اُجڑ گئیں، سہیلیاں بچھڑ گئیں
خطوط اُن کے ہاتھ بھیجنا، عجب عجب طرح

کہاں گئے وہ قافلے، کہاں گئے وہ ولولے
کوئی مجھے پکارتا رہا عجب عجب طرح

اسی کا ہو کے رہ گیا کہ اُس نے بھی ہر ایک بار
دمِ وداع روکا راستہ، عجب عجب طرح

وہ سیڑھیاں نہیں رہیں، وہ ڈیوڑھیاں نہیں رہیں
جہاں وہ میرا منتظر رہا عجب عجب طرح

میں جتنی دیر اُس گلی میں گھومتا رہا ظفرؔ
دریچہ دل کا اُس نے وا کیا، عجب عجب طرح

☆

وہ عجیب منظرِ خواب ہے
نہ وہ آب ہے نہ سراب ہے

وہ ضیا ہے بجھتے چراغ کی
وہی پس نوشتِ کتاب ہے

نہیں وہ کسی کی گرفت میں
نہ ہی اُس کا کوئی جواب ہے

وہی خود کہے وہی خود سنے
وہی آپ اپنا جواب ہے

رات ساری جاگتی سوتی رہی میں
ایک میٹھے درد میں ڈوبی رہی میں

ہونٹ اُس کے آنکھیں اُس کی ہاتھ اُس کے
چُومنے کے خواب ہی بنتی رہی میں

رہ گئی تھی اُس کی خوشبو پاس میرے
اپنی سانسیں اُس سے مہکاتی رہی میں

دیکھتی تھی اور پرکھتی تھی جہاں کو
لیکن اُس کے عشق میں اندھی رہی میں

ریت کی صورت عیاں تھی پیاس اُس کی
ایک دریا کی طرح بہتی رہی میں

فصل ایسی تھی، سہاگن کوئی جیسے
بیج وہ بوتا رہا، اُگتی رہی میں

اُس کے نینوں کے کٹوروں میں ہمیشہ
مے کی صورت خود کو چھلکاتی رہی میں

رُوپ میرا، لاٹ سُلفے کی ہو جیسے
کھینچتا وہ کش تو جل اُٹھتی رہی میں

تن کے طائر کو نہ سمجھے نیم جاں وہ
اس لیے کچھ پھڑپھڑاتی سی رہی میں

خشک کھیتی کی طرح تھا جسم اپنا
ایک وتّر سے ہری ہوتی رہی میں

اُس کے جذبوں کو بلونا چاہتی تھی
اک مدانی کی طرح چلتی رہی میں

مہرباں بھونرا تھا یوں مجھ پر کہ جیسے
سارے گلشن میں فقط کِھلتی رہی میں

پھول سے کانٹے جُدا کرنا تھے مشکل
وصل میں اس واسطے دُکھتی رہی میں

ایک پاگل کی طرح چاہا تھا اُس کو
قتل کا بھی فیصلہ کرتی رہی میں

میں نہیں ترسی جہاں کی راحتوں کو
اُس کے ہونے سے سکوں پاتی رہی میں

کر گیا وہ میری نس نس میں سرایت
محو اُس کے دھیان میں ایسی رہی میں

خوش رہی مَیں ساتھ اُس کے رات ساری
اور پھر دن بھر پریشاں سی رہی میں

میں اُسی کو ڈھونڈتی پھرتی تھی لیکن
اُس کی نظروں میں تو انجانی رہی میں

آ کہ پھر فرصت ملے ایسی نہ شاید
رات اُس کو لاکھ سمجھاتی رہی میں

کیا کہا اُس نے نجانے وصل کی شب
اور کیا مفہوم پہناتی رہی میں

سانس روکے رات اُس کے پاس پہنچی
اور واپس آنے تک سہمی رہی میں

اُس کی سانسوں کی رفاقت راس آئی
جھوٹ یہ سچ کی طرح کہتی رہی میں

کل اُسے ہر حال میں کرنا ہے رُخصت
سوچ کر یہ رات بھر روتی رہی میں

ڈھل چکی تھی رات، گاڑی آچکی تھی
تیرے جانے تک فقط جیتی رہی میں

اک قیامت آگئی، میں جی اُٹھی پھر
منتظر پھر تیرے آنے کی رہی میں

تھک گئی جب تیرا رستہ تکتے تکتے
پھر تری تصویر کو تکتی رہی میں

کیا وسیلے سے مرے پاتا وہ منزل
ایک ناہموار پگڈنڈی رہی میں

کوئی کرتا ہی نہیں میری وکالت
جانے کس پاتال میں ڈوبی رہی میں

جس کی خوشبو نے دیا سونے نہ مجھ کو
جانے منظورِ نظر کس کی رہی میں

کردیا حل دوسروں کے مسئلوں کو
اور اپنے آپ سے الجھی رہی میں

مجھ سے چھینا رزق میرا دوسروں نے
پھر اُنہی کے رزق پر پلتی رہی میں

پھول سرکنڈوں کے اُڑتے جارہے تھے
ساتھ اُن کے جاؤں، للچاتی رہی میں

اب مسیحا کا خیال آتا نہیں ہے
جیسے اُس کو بھول کر اچھی رہی میں

پاؤں محفل میں ظفرؔ پھیلائے سب نے
اور سائے کی طرح سمٹی رہی میں

☆

کیا ہُوا جو تم نکلے، حلقۂ محبت سے
پیڑ سوکھتے کب ہیں، طائروں کی ہجرت سے

یہ عجیب عادت ہے، جو بھی حاصلِ جاں ہے
اُس سے دُور بھی رہنا، دیکھنا بھی حسرت سے

اے خدا سلامت رکھ، پھول جیسے بچّوں کو
سردیوں کی شدت سے، گرمیوں کی حدت سے

میں ستارۂ شب ہُوں، صبحِ نو کا طالب ہُوں
اب اگر اجازت دو، پھر ملوں گا فرصت سے

ایسا کِھلا وصال کا گُل زار ایک رات
یکدم مہک اُٹھے در و دیوار ایک رات

تالاب سے نہا کے وہ نکلا تو بولا چاند
رُک جا اسی نواح میں اے یار ایک رات

مجھ سے زیادہ گاؤں کا پیپل اُداس تھا
جس کے تلے ہُوا کوئی اقرار ایک رات

گندم کی بالیوں میں بجّو کے خوف سے
اُس نے کِیا وصال سے انکار ایک رات

ایسا لگا کہ جیسے ہو وہ میری غم گسار
کرُلا رہی تھی کونجوں کی اک ڈار ایک رات

یہ عشق ایک رات میں ہو جائے گا اَمر
صدیاں نہیں، مجھے تو ہے درکار ایک رات

آتی رہی ہو سنگ بکف جیسے اُس کی یاد
ٹوٹا نگار خانۂ پندار ایک رات

اِک دوسرے سے کٹ کے بہت دُور جا گرے
آئی ہمارے بیچ میں تلوار ایک رات

ہو کے رہا اسیر اُنہی کا مَیں صبح تک
کھینچے جو دائرے تہہِ پرکار ایک رات

کچھ بھی نہ تھا جو دل کے عوض مَیں خریدتا
دیکھا تھا مَیں نے حُسن کا بازار ایک رات

میری خبر نہیں تھی مگر میرے خون سے
لکھا گیا تھا صبح کا اخبار ایک رات

میں کر رہا تھا غیر کی نخوت کا تذکرہ
آ کر گری زمین پہ دستار ایک رات

اُس پار ہی اگر تھا ظفؔر رات کا مزہ
ہم بھی گزارتے کبھی اُس پار ایک رات

☆

خجل بہت ہوں کہ آوارگی بھی ڈھب سے نہ کی
مِیں دربدر تو پھرا لیکن اپنے گھر بھی گیا

یہ زخمِ عشق ہے کوشش کرو ہرا ہی رہے
کسک تو جا نہ سکے گی اگر یہ بھر بھی گیا

تجھ سے ملوں یا ساجن سے
نکلوں کاش اِس اُلجھن سے

میں تو نہ بھول سکوں گی تجھے
کیا حاصل اِس اَن بَن سے

جاؤ مگر دیکھو تو سہی
لوہو بہتا انکھین سے

تُو جو گیا تو چلی گئیں
ساری خوشیاں جیون سے

جانے ملے کس عمر میں وہ
چاہا جس کو بچپن سے

ڈوب رہی ہوں اشکوں میں
مجھے غرض کیا ساون سے

ظالم کوئی زیادہ نہیں
دنیا جیسی بَیرن سے

کیا مَیں بتاؤں کتنے خار
اُلجھے میرے دامن سے

دیکھا کیسے تُو نے اُسے
پوچھا مَیں نے درپن سے

بیٹھ گئی آواز مری
ڈولی اُٹھی آنگن سے

مانگ رہی تھی اپنا لباس
بیر بہوٹی اُس تن سے

اُس نے گرم وجود کیا
میرے بدن کے ایندھن سے

میں کھیتوں میں بکھر گئی
روٹی کھاتی مکّھن سے

کیسے چھُوٹے میری جان
ایسے جھُوٹے بندھن سے

کاٹ کے رکھ دی گردن بھی
طوق نہ اُترا گردن سے

ایسے کلائی گرفت میں لی
چھنی، چھنک مِرے کنگن سے

میں نے کوئی تکرار نہ کی
اپنے اُس من موہن سے

اُس نے مجھ کو باندھ لیا
اپنے پاؤں کی جھانجھن سے

رقص کی اُجرت دی اُس نے
عزت لے لی روکن سے

میلی ہوگئی گنگا پھر
بِن اشنان ہی پاپن سے

پیاس بجھائی روہی کی
تو نے کون سے آسن سے

ایک جہان چلا آیا
ملنے مجھ بیراگن سے

پہلی بار تو خوف آیا
مجھ کو کالے انجن سے

پھر میں اُس سے لپٹ گئی
اپنے پُورے جوبن سے

جان لی اُس نے دل کی بات
میرے ہنستے نین سے

چاند نے کھڑکی کیا کھولی
ہو گئے کمرے روشن سے

تو نے رشتہ جوڑ لیا
سانس کی آون جاون سے

چادر ایک بنا ڈالی
میں نے دھوپ کی کترن سے

اپنے آپ کو ڈھانپ لیا
میں نے اُس کی اُترن سے

سارا پانی کھینچ لیا
تُو نے میرے برتن سے

حال ہے کیا مرے ساجن کا
کیسے پوچھوں سوکن سے

مجھ سے اُجڈ پنجابی کو
عشق ہوا کشمیرن سے

میرے پاس چلی آئی
اُڑ کر خوشبو چندن سے

اکثر اِک مشتاق نگاہ
آ لگتی تھی چلمن سے

کبھی کبھی دلبر کی جھلک
دیکھتا تھا مَیں روزن سے

اُس کے لیے تو اکثر مَیں
لڑ جاتا تھا دشمن سے

رات اُلجھتے دیکھا سانپ
میں نے ایک سپیرن سے

آئی نہ کوئی تتلی ساتھ
گھوم آیا مَیں گلشن سے

خالی ہوں گے اُس کے ہاتھ
گجرے لے لوں مالن سے

کرنہ سکا مَیں دل کی بات
پہلی رات سہاگن سے

اکثر اپنی گود بھری
تُو نے میرے دامن سے

کب تک مَیں بہلاؤں دل
آڑھی ترچھی چتون سے

تُو نے سیکھی نہیں اُڑان
میرے کبوتر لوٹن سے

بھوکا رہ لوں بہتر ہے
پیٹ بھروں کیا کُھرچن سے

میں بھی کوئی خوش تو نہیں
ایسے جھُوٹے بندھن سے

کیسی پھسلتی پھرتی ہے
چکنی چپڑی مکھّن سے

کیا تُو موم کی پتلی ہے
جلتی ہے جو سوکن سے

آیا ہوں بیزار بہت
مَیں تیرے ہر لچھن سے

بُرا کِیا جو پیار کِیا
میں نے ظفرؔ اُس ناگن سے

☆

تُو اگر آغاز ہے انجام ہو جاؤں گا مَیں
دیکھنا اے دن کہ تیری شام ہو جاؤں گا مَیں

ڈول جائیں گے ترے بازو ترازو کی طرح
اور تیرے سامنے نیلام ہو جاؤں گا میں

تیری حیثیت بڑھا دوں گا گھٹا کر اپنی قدر
خاص ہو جائے گا تُو اور عام ہو جاؤں گا مَیں

تُو کہے گا تو کبھی مقطع نہ لکھوں گا ظفرؔ
شاعری کے باب میں بے نام ہو جاؤں گا مَیں

ہوا جو ختم امتحاں تو ہوگیا وہ مہرباں
برس کے ٹکڑا ابر کا گیا تو چین آگیا

سمٹ سمٹ کے یوں ہی کر رکھی تھی زندگی تباہ
وہ مجھ کو جب بکھیر سا گیا تو چین آگیا

ہوئے تھے ایک جسم و جاں، نہیں تھا کوئی درمیاں
حجاب سب وہ جب اُٹھا گیا تو چین آگیا

خیال تھا کہ لوٹ کر نہ آئے گا وہ اب اِدھر
دریچہ دل کا کھٹکھٹا گیا تو چین آگیا

وہ سنگ تھا اُسے تراش کے بنایا دیوتا
مگر وہ دل کو جب لبھا گیا تو چین آگیا

سلا گیا تو سو گئی، جگا گیا تو جاگ اُٹھی
وہ بن کے شام، بیت سا گیا تو چین آگیا

پڑے پڑے ہی بوڑھی ہو رہی تھی زندگی مِری
وہ میری عمر کچھ گھٹا گیا تو چین آگیا

وصال طول کھینچتا تو میری جان کھینچتا
جو درمیاں میں ہجر آگیا تو چین آگیا

کہ چین آ نہیں رہا تھا میرا چین لُوٹ کر
وہ اپنی زندگی لٹا گیا تو چین آ گیا

ظفرؔ مِرا شمار بزدلوں میں تھا مگر مَیں آج
لہو اچھالتا ہوا گیا تو چین آ گیا

☆

نئے گھر کی پرانی تختیاں تبدیل کرنے میں
کٹی ہے زندگی اپنی مکاں تبدیل کرنے میں

میں جب بھی دکھ سناتا ہوں کئی دکھ اور بڑھتے ہیں
بڑی ماہر ہے دنیا داستاں تبدیل کرنے میں

جو بات آنکھوں سے کرتا ہے اور آنکھیں پھیر لیتا ہے
اُسے کیا دیر لگتی ہے بیاں تبدیل کرنے میں

ظفر اچھا ہے یوں تو شہروں شہروں گھومنا لیکن
کئی دشواریاں بھی ہیں نشاں تبدیل کرنے میں

جاتی ہوئی بہار تھی
مٹتا ہوا نشان تھا

مٹی ہوئی تھی آرزو
سجا ہوا دالان تھا

ٹوٹ گئی وہ بانسری
دل یہ جس کی تان تھا

بجھی ہوئی تھی زندگی
جلا ہوا لوبان تھا

سوکھ گئے تھے گل سبھی
خالی ہر گل دان تھا

باہر جوبن پر نکھار
اندر اک سرطان تھا

پیروں میں زنجیر تھی
سر اوپر قرآن تھا

ہیر کی جھوٹی رخصتی
کھیڑا بے ایمان تھا

رخصت کے سامان میں
میرا بھی سامان تھا

تُو نے مجھ کو کھو دیا
میں تری مسکان تھا

کاش تُو آتا اس طرف
دل بھی اک استھان تھا

جیون اُس مٹیار کا
ہرا بھرا کھلیان تھا

کیا بوتا کیا کاٹتا
فصل سے بڑھ کے لگان تھا

تنہائی کے بھیس میں
تُو تھا یا بھگوان تھا

دیکھ کے تجھ کو آئنہ
میری طرح حیران تھا

نجانے کیوں تھی مَیں اُس کے بغیر بے کل سی
کہ کُھر درا سا تھا وہ اور مَیں تھی مخمل سی

مہک رہے تھے گُلاب اُس کی گرم سانسوں کے
وہ شام کی تھی گھڑی، شام بھی تھی کاجل سی

جب اُس کے وصل کی حدّت مجھے نصیب ہوئی
دہک رہی تھی مَیں اُس وقت سرخ صندل سی

وہ میری پیاس بجھانے ازل سے آیا تھا
اور اُس کے پاس مِرے واسطے تھی چھاگل سی

خدا کرے کہ مجھے بھی اُڑا کے لے جائے
جو آسمان پہ کالی گھٹا ہے آنچل سی

وہ میری روح میں روپوش تھا کہیں شاید
کہ جس کے ہونے سے پھوٹی، مَیں نرم کونپل سی

یہی تھا عشق کہ وہ مجھ سے دُور رہ نہ سکا
وہ نرم دھوپ تھا اور مَیں چمکتے پیتل سی

پیالہ حُسن کا اُس کے لبوں کو چھُو آیا
کہ ہوگئی تھی مَیں رات آپ اپنے سانول سی

نہال کیسے نہ ہوپاتی پور پور مری
مجھے نصیب تھی اک شامِ وصل بادل سی

ہزار وصف تھے مجھ میں جو اُس پہ کھُل نہ سکے
میں اُس کے ساتھ بھی رہ کے تھی اس سے اوجھل سی

یہی بہت ہے کہ تجھ تک پہنچ گئی ورنہ
میں جس طرف بھی گئی راہ میں تھی دلدل سی

میں اُس کو بھول چکی تھی مگر ہے یاد اتنا
نشیلے نین تھے، صورت تھی اُس کی شیتل سی

یہ اور بات کہ تاریکیاں تھیں میرا نصیب
میں اُس کی راتوں میں جلتی رہی تھی مشعل سی

اُسے گزارا تو معنیٰ کئی کھُلے اُس کے
سمجھ رہی تھی مَیں جس زندگی کو مہمل سی

نصیب جو بھی ہوا وصل وہ غنیمت ہے
کہ مَیں نے کی تھی محبت ہی نامکمل سی

میں زندہ ہوں کہ مسیحائی اُن لبوں نے کی
وگرنہ دنیا تو میرے لیے تھی مقتل سی

نجانے کون سے کارِ جہاں پہ ہوں مامور
کبھی بحال سی مَیں اور کبھی معطّل سی

اگر چیکتی نہ اُس سے تو اور کیا کرتی
کہ بھیگا اُس کا بدن اور مَیں تھی ململ سی

سنا ہے اب تو وہاں بھی اُگ آئے گل بُوٹے
ہمارے وقتوں میں تھی جو زمین چٹیل سی

اب اس کو سوچتی ہوں اور آہ بھرتی ہوں
کہ اب کہاں وہ ملاقات روزِ اوّل سی

بحال کیسے نہ ہوتی طبیعت اُس کی ظفؔر
مَیں تھی سلوک میں اپنے، کوار گندل سی

☆

ایک ضابطہ چاہیے زندگی میں، ایک حوصلہ چاہیے دوستی میں
ویسے لوگ اب ایسے کم رہ گئے ہیں، بازی جیت کے مان لیں مات اپنی

دل کی دھڑکنیں بند صندوق جیسی، اور آنکھ میں شرم معشوق جیسی
اتنا جانتے بوجھتے بھی ظفؔر مَیں تجھ سے کہہ سکا کب کوئی بات اپنی

منزل کھو جاتی تھی رستا رہ جاتا تھا
اور مَیں گرد کی صورت بیٹھا رہ جاتا تھا

میں روتا یا شاخیں شیشم کی روتی تھیں
ساون میں جب خالی جھولا رہ جاتا تھا

ایک اندھیرا چھا جاتا تھا چاروں جانب
اور دھندلا کے منظر سارا رہ جاتا تھا

باقی جو بینائی رہ جاتی تھی، اُس سے
جانے والے کو مَیں تکتا رہ جاتا تھا

میں یہ سمجھتا، واپس آئے گا نہ کبوتر
جب کوئی پَر شاخوں میں اٹکا رہ جاتا تھا

پڑھنے سبق جب عشق کا جاتا تھا مکتب میں
اکثر گھر میں میرا بستہ رہ جاتا تھا

اس درجہ بے وزن لگن ہوتی تھی میری
میں ہر باٹ کے آگے ہلکا رہ جاتا تھا

یہ تھا محض خیال کہ چاہت کی صورت میں
ہونٹوں پر ہونٹوں کا تحفہ رہ جاتا تھا

کر دیتا تھا سارا حسن حوالے میرے
پھر بھی کوئی نہ کوئی پردہ رہ جاتا تھا

غائب ہو جاتی تھی مرشد والی صورت
سناٹے میں ڈوبا حُجرا رہ جاتا تھا

نیند مِری آنکھوں سے رخصت ہو جاتی تھی
بس آنکھوں میں اُس کا سپنا رہ جاتا تھا

بھیک مجھے دیدار کی ملتی تھی کب اُس سے
بس نینوں کا خالی کاسہ رہ جاتا تھا

مال و زر تو سارا غیر ہی لے جاتے تھے
میرے ہاتھ میں کھوٹا سکّہ رہ جاتا تھا

عشق میں جلتے دل کی حالت کیا مَیں بتاؤں
آدھا جل جاتا تھا، آدھا رہ جاتا تھا

جب بھی سوچتا تھا مَیں آزادی کے حق میں
پنچھی اُڑ جاتا تھا پنجرہ رہ جاتا تھا

اب مَیں سوچتا ہوں تو یاد نہیں کچھ آتا
اُس کے جانے پر بھی کیا کیا رہ جاتا تھا

اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا تھا مَیں
کہنے والا سارا قصّہ رہ جاتا تھا

پل میں چل دیتا تھا پھیر کے آنکھیں مجھ سے
اور اُتر کے سارا نشّہ رہ جاتا تھا

آنکھوں کے آگے وہ آنکھیں رہ جاتی تھیں
چہرے کے آگے وہ چہرہ رہ جاتا تھا

جانے کیوں مَن کی بھٹی میں پریم کٹورا
آگ جلانے پر بھی کچّا رہ جاتا تھا

چوکیدار بھی سو جاتا تھا رات کو اکثر
میں ہی اُس کی گلی میں تنہا رہ جاتا تھا

میں کتنا مرتا تھا اُس پر، ظفر کہوں کیا
بس اِتنا مَرتا تھا، زندہ رہ جاتا تھا

☆

کتنا مشکل ہے محبت میں نباہ
کتنا آساں ہے سہاگن ہونا

گرجا کی گھنٹیوں نے مِری نیند تو اُڑائی
تُو ہے کہاں کہ تیری صدا آج تک نہ آئی

انجیل سامنے تھی خُدا سامنے نہ تھا
اُس نے کتابِ زیست مجھے اس طرح پڑھائی

رنگت گلاب سی تھی کفن سا لباس تھا
جس راہبہ سے مجھ کو مہک زندگی کی آئی

اُس نے بھی ایسٹر نہ منایا سکوں کے ساتھ
میں نے بھی ایک عُمر سے دھونی نہیں رمائی

دونوں ملول ہیں تو یہ کیسے کھُلے ظفؔر
اُس نے شکست کھائی کہ مَیں نے شکست کھائی

تمہیں کبھی جو "ظفروال" کی ہَوا لگتی
مَیں پوچھتا کہ ہے کیسا کہو خُدا لگتی

میں بدنصیب ہُوں اور جاں بلب ہوں اُس کے بغیر
جو زندہ ہوتی تو ماں کی مجھے دُعا لگتی

مرے لیے جو بھی اجنبی ٹھہرنا تھا
تو کاش پھر کوئی صورت نہ آشنا لگتی

نصیب میں نہ تھا رہنا تمہارے پہلو میں
تو کاش پھر مجھے دنیا نہ دل رُبا لگتی

تمہارے بعد کسی کی طرف نہیں دیکھا
تمہارے بعد بھلی کیا کوئی ادا لگتی

پل دو پل کی چاہت میں
زرد ہوئی مَیں رنگت میں

ڈھونڈ رہی ہوں جوانی کو
پچھلی رات کی صحبت میں

لگ جا میرے سینے سے
کیا رکھّا ہے نفرت میں

جینا اگر دشوار ہُوا
مر جاؤں گی محبت میں

اپنے آپ کو پہچانا
میں نے تیری قربت میں

پار لگاتی کیا تجھ کو
ڈوب گئی خود لذّت میں

تجھ سے ملی تو ہوش آیا
اب تک تھی مَیں غفلت میں

ساری عزت کھو کر بھی
کمی نہ آئی عزت میں

گزر کے دہر کے دوزخ سے
پہنچی ہوں مَیں جنت میں

سارا اضافہ تُونے کیا
میرے پیار کی شدت میں

اور کسی کو نہیں دیکھا
میں نے تیری صورت میں

ساری دشواری دیکھی
میں نے ایک سہولت میں

میں نے تجھے سنبھالا تھا
مِلا تھا تُو کس حالت میں

سب کچھ تمہیں بتاؤں گی
ملنا تم کبھی فرصت میں

تیری ہی اِک یاد آئی
مجھ کو تو بس ہجرت میں

بھولی تجھے مری صورت
کیا دیکھا تھا سیرت میں

ترس رہی ہوں اُس گھر کو
چھوڑ دیا جو وحشت میں

سب کو پیار نہیں ملتا
لکھنا ہے یہ وصیّت میں

سوچ بچار ضروری ہے
عہد کروں کیا عجلت میں

ساری دنیا جانتی ہے
میں ہوں کس کی حمایت میں

پہلے مری محبت تھا
شامل ہے اب عادت میں

ساری عمر کے روگ لگے
چار دنوں کی چاہت میں

یہ جو سلوک ہُوا مجھ سے
ہوتا ہے کیا چاہت میں

کوئی کسر نہیں چھوڑی
میں نے تیری زیارت میں

تیرا پیار اگر ملتا
جی لیتی مَیں عُسرت میں

ظاہر باطن ایک مِرا
دیکھا تُو نے خلوت میں

شاید اِسی کا نام ہے عشق
کمی نہ آئی رغبت میں

میرے رُوپ کا جادُو ہے
تیری شان و شوکت میں

دل سا نگر نہیں دیکھا
میں نے سیر و سیاحت میں

گلی محلّے ختم ہوئے
اپنی نئی سکونت میں

عزتِ نفس گنوا ڈالی
میں نے تیری خدمت میں

مجھ کو بھی شامل کر لے
اپنے ہُنر کی طاقت میں

تُو نے خیانت کر ڈالی
میری ایک امانت میں

رات کی بات کو بھول بھی جا
میں ہوں غرق ندامت میں

کھینچ ہی لاؤں گی تجھ کو
اِک دن دل کی عدالت میں

سوچوں دیکھ کے ظلم ترا
کیا ہے دیر قیامت میں

تُو نے شامل کر ڈالا
کتنا جھوٹ حقیقت میں

تُو نے میرا نام لکھا
کیوں اشیائے ضرورت میں

مجھ کو بھی کھو ڈالا ہے
تو نے آج رعونت میں

ظالم تُو نے بگاڑ دیا
سارا کھیل کدورت میں

کل اِک نئی سحر ہو گی
بھول گیا تُو ظلمت میں

کرتے رہے گمراہ مجھے
کیا کیا نقش مسافت میں

جب تک تیرا ظلم رہا
شامل رہی بغاوت میں

غارت کر دی میری شام
تُو نے آج شرارت میں

ہو گیا تیری باندی کا
آٹا گیلا غُربت میں

پردہ پوشی جو کرتا
کوئی نہیں تھا خلقت میں

میں تو کہیں کی نہیں رہی
رہ کے تیری رفاقت میں

بے حُرمت کوئی کیا جانے
کیا ہوتا ہے حُرمت میں

ایسا اُچاٹ ہوا ہے جی
لگتا نہیں عبادت میں

تیرا ہے کوئی دخل ضرور
اس بے چین طبیعت میں

غیر کے ہاتھوں بیچ دیا
میرا عشق رقابت میں

تیری بھی قیمت شامل کی
میں نے اپنی قیمت میں

سیدھا سادا پیار مرا
پڑ گئے آپ سیاست میں

اپنا کیس خراب کیا
میں نے تیری وکالت میں

کتنے تار ہمارے ہیں
اس دستارِ فضیلت میں

پہلے بربادی میں شریک
اب مصروف نصیحت میں

اپنا بنا کے تُونے مجھے
ڈال دیا ہے مصیبت میں

جب بھی ہوئی خوش، یاد آیا
کاٹی عمر اذیّت میں

میرا بھی سودا کر ڈالا
تُونے عیش و عشرت میں

میرا کون سا کام کیا
لے کر مجھ کو رشوت میں

تُونے مجھ کو پلا دیا
زہر ملا کے شربت میں

مجھ کو بھی جھٹلا ڈالا
تُونے رب کی نعمت میں

مجھ کو اپنا ہوش نہیں
کیا لکھوّں تری مدحت میں

ساری عمر گنوا ڈالی
میں نے صرف ریاضت میں

شاید منزل مل جاتی
بھٹکی تری قیادت میں

میں جو راہ پہ آئی نہیں
کوئی کمی تھی ہدایت میں

رس کی بجائے گھول دیا
تُو نے زہر سماعت میں

کیا جانے کب آئیں ظفرؔ
اچھے لوگ حکومت میں

☆

دُور کی باتیں سوچتے رہنا، دور کا منظر دیکھنا
اس جیون میں لاحاصل ہے، پیچھے مُڑ کر دیکھنا

دنیا کے ویرانے سے تو کانٹے چننا سارا دن
رات کو لیکن خواب میں خود کو بسترِ گل پر دیکھنا

چھوڑ میری خطا
تُو تو پاگل نہیں

☆

چُراتا نہیں ہے کسی سے نظر
ہے آئینہ خود کو بنایا ہُوا

☆

AGHA!

بولتا ہے مِرے خلاف مگر
بولتا تو وہ خوبصورت ہے

☆

وہ تری گرفت میں کیا رہے
کبھی پانی آتا ہے جال میں

☆

Nice

اِس دشت میں گھر کہاں ملے گا
میں آنکھ ہوں میرا خواب ہو جا

☆

حال یہ ہے کہ کہہ رہا ہوں ظفرؔ
ہر غزل آخری غزل کی طرح

شعر کچھ گرتے پڑتے سوچتا ہُوں
اور کچھ آگے بڑھتے سوچتا ہُوں

مجھے گرنا ہے کس بلندی سے
سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے سوچتا ہوں

کچھ خیال آئیں، کچھ نہ پڑھتے ہوئے
اور کچھ پڑھتے پڑھتے سوچتا ہوں

اپنی مرضی سے کاش اِدھر آتا
خاک میں گڑتے گڑتے سوچتا ہُوں

لوگ ہیں کتنے مصلحت اندیش
بات پر اڑتے اڑتے سوچتا ہوں

چھاؤں دیتے نہیں ہیں جو اشجار
کیوں نہیں وہ اُکھڑتے سوچتا ہُوں

جیسے بگڑے ہیں مجھ سے کچھ احباب
نہ وہ ایسے بگڑتے سوچتا ہوں

جیسے اُجڑے ہیں اپنے کچھ آنگن
نہ وہ ایسے اُجڑتے سوچتا ہُوں

اس لڑائی میں کیا رکھا ہے ظفرؔ
بات یہ لڑتے لڑتے سوچتا ہوں

☆

بندِ قفس ہو، بند قبا ہو یا وہ بندِ غم ہو
دیر سے کھلنے والے سارے بند بُرے لگتے ہیں

اپنے جاننے والوں میں بھی، کتنے لوگ ہیں ایسے
ملنا پڑتا ہے جن سے، ہر چند بُرے لگتے ہیں

ہمت افزائی تو سب کی، ہونا چاہیے لیکن
کام سے پہلے نام کے خواہش مند بُرے لگتے ہیں

جو بات عام سی تھی وہ عوام کے لیے کہی گئی
مگر جدید تر غزل تمام کے لیے کہی گئی

وہ برف سے ڈھکے ہوئے وجود آگ کے ہیں منتظر
یہ گرم داستان سرد شام کے لیے کہی گئی

سرور کا جہان رقص میں سہی مگر سنو جو بات
رکوع اور سجود اور قیام کے لیے کہی گئی

خیال ہے کہ فرش پر ہی عرش کو بلا لیا گیا
سفر کی بات یوں ہی خوش خرام کے لیے کہی گئی

بس ایک رُخ سے دیکھ اور پڑھ رہے ہو تم جسے ظفرؔ
طرح طرح سے بات اُس کلام کے لیے کہی گئی

نہ چھُپ سکے گی ترے بانجھ پن کی عریانی
مِرے وصال کی اوڑھی ہوئی ردا کے بغیر

ترے بغیر بھی کچھ دن گزار ہی لوں گا
گزر گئی ہے بہت زندگی، خدا کے بغیر

میں نرم و گرم طبیعت تری سمجھتا ہوں
ترا گزارا نہیں مجھ سے مبتلا کے بغیر

کھُلے گا تجھ پہ یہ کچھ روز میں کہ تُو ایسے
مِرے بغیر ہے، جیسے بدن قبا کے بغیر

میں ہو کے دُور "ظفروال" سے، ہُوں خوار ایسے
اُداس جیسے سلیماں پھرے، سبا کے بغیر

ظفرؔ ہَوا تھی جدھر کی، اُدھر کبھی نہ گیا
مگر مَیں سانس نہیں لے سکا ہَوا کے بغیر

یہ بھی کیا زندگی ہماری ہے
تُو نہیں اور سانس جاری ہے

اک سواری رواں دواں ہے ابھی
یہ مگر آخری سواری ہے

کیا ملا ہم کو، یہ نہیں معلوم
واقعہ یہ ہے جان ہاری ہے

کر رہے ہیں جہان سے پردہ
اب یہی اپنی پردہ داری ہے

ایک دو پل نثار کیا کرتے
اُن پہ قربان عمر ساری ہے

تھے تمنا کبھی تمہاری ہم
اب تمنا ہمیں تمہاری ہے

دن بِتائے ہوئے بتائے ہیں
شب گزاری ہوئی گزاری ہے

آج صابر ظفر دعا کیجے
آج کی رات سخت بھاری ہے

مجھے تو غرق ہونا تھا تری چُپ کے سمندر میں
صدائیں دیں کناروں نے مگر مَیں نے تجھے چاہا

☆

بہت آہستگی سے چل رہی ہے نبضِ جاں، جیسے
یہ گاڑی رکنے والی ہے مسافر جانے والا ہے

☆

جیت جانا مِرا، شاید تجھے برداشت نہ ہو
کھیل ایسے کہ مجھے ہار کا موقع دے دے

☆

بکھر رہا ہوں مَیں ایسے کہ دیکھنا ہے عذاب
یہ حال چاہے جو تُو دیکھنا ضرور، تو دیکھ

☆

تُو جسے قابلِ پرواز بنائے گا ظفرؔ
وہ پرندہ ترے ہاتھوں سے نکل جائے گا

کیا یہ تقدیر کا ٹھٹھول نہیں
یاد بھی تیری، میرے کول نہیں

زندگانی کے اِس ڈرامے میں
شاید اب اپنا کوئی رول نہیں

ہوچکا ختم، زیست کا سودا
سانس کی گٹھریاں ٹٹول نہیں

پھر رہے ہیں کچھ ایرے غیرے اِدھر
ابھی دروازہ دل کا کھول نہیں

زیرِ لب یہ جو مسکراہٹ ہے
اِس عنایت کا کوئی مول نہیں

کوئی اچھا نہیں مَیں سازندہ
اور گلے جو پڑا وہ ڈھول نہیں

تبصرہ ظلم پر ہے جاں لیوا
تجھ سے کیسے کہوں کہ بول نہیں

لب ہیں شیریں ترے، سخن شیریں
ایسے امرت میں زہر گھول نہیں

اب کہانی ہی ختم ہے صابرؔ
اب کہانی میں کوئی جھول نہیں

☆

ہمیشہ حلقۂ نامہرباں میں رہتے ہیں
جو حق پہ ہوتے ہیں وہ امتحاں میں رہتے ہیں

حسد کی آگ سے کس کس کا گھر جلاؤ گے
کہ اہلِ عشق تو سارے جہاں میں رہتے ہیں

خدا کا ماننے والا یہاں کوئی تو ہو
ہم اس خیال سے شہرِ بتاں میں رہتے ہیں

تجھے جو رنج ہے کچھ اُس سے بھی سوا ہے مجھے
خدا نے کیوں تری تقدیر میں لکھا ہے مجھے

ٹھہر گیا ہوں یونہی تیرے روز و شب میں کہ تو
مثالِ شامِ جدائی گزارتا ہے مجھے

یہ شہر اپنی روایت میں خوبصورت ہے
مگر یہ شہر بھی اک روز چھوڑنا ہے مجھے

گیا تھا دہر سے تحسینؔ سروری جیسے
اُسی طرح کوئی لمحہ پکارتا ہے مجھے

یہ جی میں ہے کہ مروں بھی تو خاک داں سے دُور
ظفرؔ میں ایک ستارہ ہوں ٹوٹنا ہے مجھے

دل تڑپتا ہے اور ڈھونڈتا ہے
کوئی پل، صبح و شام سے باہر

ہے کہیں تُو، میں دیکھنا چاہُوں
کائنات، انتظام سے باہر

لاتعلق ہے مجھ سے کس لیے تُو
کیا ہُوں تیرے نظام سے باہر

یہ حجاب اور یہ تصنّع چھوڑ
مل کبھی احترام سے باہر

جو نہ پہنچائے میرے مسکن تک
نکل ایسے خرام سے باہر

جان لے کے رہے گا میرا خدا
میں نہیں انتقام سے باہر

نکلو حجرے سے اور دیکھو حضور
لوگ ہیں کچھ غلام سے باہر

مستقل اِک قیام ہو صابرؔ
عمر بھر کے قیام سے باہر

اسی لیے مَیں ابھی روشنی میں آیا نہیں
تلاش جس کی ہے وہ زندگی میں آیا نہیں

نہال ہو کے مری روح مَر مٹے جس پر
ابھی وہ پل تری دوشیزگی میں آیا نہیں

بھٹک کے دُور نکل جاتا یادِ یار سے مَیں
مگر وہ مرحلہ آوارگی میں آیا نہیں

ندی ہی جا کے گری ہے سدا سمندر میں
کبھی اُچھل کے سمندر ندی میں آیا نہیں

بچا کے رکھّے اجل سے جو زندگی کو ظفرؔ
ابھی وہ رنگ تری شاعری میں آیا نہیں

دل جلا ہی نہیں بجھا بھی ہے
بجھ کے پھر راکھ سا اُڑا بھی ہے

کیسے اپنے مقام تک پہنچوں
راہ میں ایک کربلا بھی ہے

جاننے کی نہیں ہوئی توفیق
سُن رہا ہوں کوئی خدا بھی ہے

یہ جو تجھ کو نہ ماننے کی ہے بات
اس میں شاید مِری خطا بھی ہے

عشق میرا، مری جزا ہی نہیں
عشق میرا، مری سزا بھی ہے

بے سبب تو نہیں ہوئی دُوری
درمیاں کوئی تیسرا بھی ہے

ایک ہی وقت میں کوئی صابرؔ
اجنبی بھی ہے آشنا بھی ہے

یہ بھی کیا کم ہے کہ ٹیلے تو ہوئے کچھ ہموار
بنتی جاتی ہے نئی راہ گزر پانی سے

☆

یہ علم ہے کہ ٹھہرنا یہاں قیامت ہے
مگر یہ کیا کہ ہمیشہ کسی سفر میں رہو

☆

ابھی تو روح کا قرضہ بھی میرے جسم پہ ہے
سمجھ لیا یونہی میں نے، حساب ختم ہوا

☆

جس شخص کی فرقت میں تری آنکھ ہے پُر نم
اُس شخص کا ماتم تو مرے گھر بھی ہُوا ہے

☆

کاش اُس پر چل بھی سکتا مَیں کبھی
عمر بھر ہموار جو رستہ کیا

☆

اب رہ گزر میں کوئی کروں گا نہ فیصلہ
یہ فیصلہ بھی مَیں نے سرِ رہ گزر کیا

ہم کو بھی ایک آدھ شام، شاملِ حال کیجیے
آپ کے جاں نثار ہیں، کچھ تو خیال کیجے

باندھ کے دل کی ڈور کو، چُھو کے ہر ایک پور کو
جان میں جان ڈالیے، سانس بحال کیجیے

آپ کے ہر قدم کے ساتھ، رقص کناں ہے کائنات
ختم ہو رقص تو بپا، جشنِ وصال کیجیے

ردِّ عمل بھی ہو اگر، کوئی خلل بھی ہو اگر
پیچھے نہیں ہٹیں گے ہم، آپ سوال کیجیے

اب تو قریب آگئی، ساعتِ آمدِ سحر
چھوڑیے ذکرِ شب ظفرؔ، اب نہ ملال کیجیے

دل بنایا گیا لگن کے لیے
اور بدن دوسرے بدن کے لیے

جتنے بھونرے ہوں اُتنی کلیاں ہوں
یہ ضروری ہے اب چمن کے لیے

دل جلاؤ اگر جلانا پڑے
دائمی عشق کی اگن کے لیے

دن درندہ ہے اس سے دُور رہو
رات کافی ہے پیرہن کے لیے

ان لبوں سے ظفرؔ کو زندہ کرو
یہ نہیں ہیں فقط سخن کے لیے

یہاں نہیں ہے اگر روشنی، یہاں سے نکل
اور اس سے پہلے کہ گر جائے، اس مکاں سے نکل

عجب ترنگ ہے تنہا بھٹکتے رہنے میں
نہیں ہے کوئی بھی منزل تو کارواں سے نکل

سبھی خموش ہیں اور منتظر بہار کے ہیں
خزاں سے کون کہے، صحنِ گلستاں سے نکل

گھنے درختوں سے خالی نہیں ہوا یہ جہاں
اگر شکستہ ہیں شاخیں تو آشیاں سے نکل

وطن سے دُور بھی دُشواریاں تو ہوں گی مگر
وطن میں دُکھ نہیں ہوتے ہیں اس گماں سے نکل

مخل ہے میرے سخن میں اِک ایسے عجز کی پھانس
جسے مَیں کہہ نہیں سکتا، مِری زباں سے نکل

جہان اور بھی ہوں گے ظفرؔ، تلاش تو کر
خیال ہی میں سہی قیدِ دو جہاں سے نکل

تری جدائی کی اب کوئی شام یاد نہیں
کہاں کہاں ہوئیں نیندیں حرام یاد نہیں

تمام زندگی جس کی پناہ میں گزری
وہ تیغ کیوں ہوئی دل میں نیام یاد نہیں

تلاش جس کی ہے اُس کا نشاں نہیں معلوم
پکارنا ہے جسے، اُس کا نام یاد نہیں

ہزار کام تھے جس سے مجھے محبت میں
وہ آ گیا ہے تو اب کوئی کام یاد نہیں

رکھوں گا یاد بھلا شاعری تمہاری کیا
ظفرؔ مجھے تو خود اپنا کلام یاد نہیں

رنگ ہی رنگ ہیں تصویر نہیں ہے کوئی
اور اس خواب کی تعبیر نہیں ہے کوئی

پُرزے پُرزے ہوئی جاتی ہے کتابِ ہستی
اور کسی پُرزے پہ تحریر نہیں ہے کوئی

داستاں ظلم کی خود لکھتے ہو کیوں مظلومو
کیا یہاں کاتبِ تقدیر نہیں ہے کوئی

اب تو دنیا میں ہیں دُکھ بھی نئے شاعر بھی نئے
باوجود اِس کے یہاں میرؔ نہیں ہے کوئی

☆

تم پہنو، جو لباس جو گہنا پسند ہے
ہم کو تو صرف خاک میں رہنا پسند ہے

اُس عشق کی طرح کہ ہے جس کا ٹھکانا دل
دریا کو اپنی موج میں بہنا پسند ہے

کس کس طرح وہ ٹوٹ کے چاہیں نہ پوچھو کچھ
جن عورتوں کو ظلم ہی سہنا پسند ہے

حالانکہ ہم نیام میں رہنے کے حق میں ہیں
شمشیر پھر بھی کوئی برہنہ پسند ہے

PHIR JEALOUSY

نشاطِ زیست عیاں ہے ملال ظاہر ہے
میں تیرے سامنے ہُوں میرا حال ظاہر ہے

نہ جب خیال ہے تیرا، نہ خواب ہے تیرا
تو میں بھی ہوگیا خواب و خیال، ظاہر ہے

سزائے مرگ مجھے دے گا اپنے ہاتھوں کیا
اُس آدمی پہ خود اپنا زوال ظاہر ہے

وہی بڑا ہے جو تنہا ہے اس جہاں میں ظفؔر
مِرے علاوہ خدا کی مثال ظاہر ہے

☆

سکت نہیں تو کسی کا مقابلہ مت کر
یہ دشمنوں کا نگر ہے یہاں سے ہجرت کر

ہر اک کی بات کو سن اور طفلِ مکتب رہ
بزرگ بن کے نہ ہر شخص کو نصیحت کر

جو ہو سکے تو کوئی انقلاب لا، ورنہ
ہر اک اصول، ہر اک فلسفے سے نفرت کر

جہانِ مکر میں محتاط رہ ذرا، صابؔر
ہر آدمی کو پرکھ اور پھر محبت کر

یہ بار بار جو ہم بام و در بناتے ہیں
وہ ہجرتی ہیں جو پانی پہ گھر بناتے ہیں

بس ایک وقت ہے اور وقت بھی محبت کا
نہ کوئی شام نہ کوئی سحر بناتے ہیں

امیدوار ہیں ہم بھی صبا بھی خوشبو بھی
یہ دیکھتے ہیں کسے ہم سفر بناتے ہیں

اُجڑ رہا ہو کوئی چاہے بس رہا ہو کوئی
بنانے والے تو اپنی خبر بناتے ہیں

ہم اپنی بات کہ اکثر جو بن نہیں پاتی
کبھی طویل کبھی مختصر بناتے ہیں

یہ اور بات کہ منزل ہمیں نصیب نہ ہو
مگر ہم اپنی الگ رہ گزر بناتے ہیں

خود ان کی بات میں چاہے اثر نہ ہو صابرؔ
ہماری بات مگر بے اثر بناتے ہیں

جو میرا خواب نہیں کس لیے اُسے دیکھوں
جو بوجھ مجھ پہ نہیں مَیں اُسے اُٹھاؤں کیوں

☆

مرنے سے پہلے زیست ہے جینے کے بعد موت
پر زیست اور موت کے ہے درمیان کیا

☆

اُگا ہُوا ہوں ہر اک جا مثالِ سبزہ مَیں
جہاں بھی پاؤں پڑے پائمال ہو جاؤں

☆

جدھر رواں ہوں اُدھر تو نہیں مِری منزل
جو میرے ساتھ ہے وہ ہم سفر نہیں میرا

☆

اگرچہ کچھ بھی نہیں دوری و حضوری میں
مگر یہ شوق، اُسے اپنے پاس بھی دیکھوں

☆

پانیوں کی نذر ہو جاتا ہوں خود کاغذ کی کشتی کی طرح
جس طرف پھر موج لے جاتی ہے مجھ کو اُس طرف بہتا ہوں میں

خیال میں تو اُسے ہم خیال جانتے ہیں
مگر وصال ہے اُس کا محال، جانتے ہیں

تمہارا عشق ہمیں مات ہونے دیتا نہیں
وگرنہ لوگ جو چلتے ہیں چال، جانتے ہیں

نہ جانے اور طرح، اس طرح تو جانے وہ
ہوائے دشت کو جیسے غزال جانتے ہیں

جسے بھی دیکھو، گرفتار عشق میں ہے وہی
مگر یہ عشق ہے کیا، خال خال جانتے ہیں

کرے گا تیرا تعاقب سدا، ترا ماضی
یہ اور بات کہ ہم صرف حال جانتے ہیں

کسی کے سامنے کیا، دل نکال کر رکھنا
یہاں تو سب ہی طبیعت بحال جانتے ہیں

ہے آئنے میں کوئی اور شاید اُس جیسا
وگرنہ ہم تو اُسے بے مثال جانتے ہیں

یہ جانتے ہیں کہ آئے گا کب وصال کا پل
نہ کوئی دن نہ مہینہ نہ سال جانتے ہیں

بس ایک نام کی جپتے ہیں رات دن مالا
بس ایک نام تمہارا وشال جانتے ہیں

نصیب وصل ہو جس کے جواب میں تیرا
تمام لوگ کہاں وہ سوال جانتے ہیں

تری طلب ہمیں پھر بھی سفر پہ اکسائے
اگرچہ ہوں گے فقط ہم نڈھال، جانتے ہیں

مگر وہ ظلم کہ ہم رہ نہیں سکے خاموش
ہمیں نہیں ہے سخن کی مجال، جانتے ہیں

اگر وہ خون بھی تھوکے تو ہو وہ کم شاید
ہم اُس کا درد، ہم اُس کا ملال جانتے ہیں

جہاں خرام نہ وہ خوش خرام کرتا ہو
ہم اُس زمیں کو ظفرؔ پائمال جانتے ہیں

☆

دیکھنا یہ ہے کہ ناپید و نمودار پہ ہم
کس یقیں سے ترے ہونے کا گماں کرتے ہیں

جینے کا درس سب سے جدا چاہیے مجھے
اب تو نصابِ زیست نیا چاہیے مجھے

اے کاش خود سکوت بھی مجھ سے ہو ہم کلام
میں خامشی زدہ ہُوں صدا چاہیے مجھے

اب میرے پاس جرأتِ اظہار بھی نہیں
کیسے بتاؤں آپ کو، کیا چاہیے مجھے

سب کھڑکیاں کھلی ہیں مگر حبس ہے بہت
جاں لب پہ آچکی ہے ہَوا چاہیے مجھے

○

میں جو اس شہر میں ہوں یہ مِری مجبوری ہے
بول اے دوست کہ آیا ہے یہاں تُو کیسے

میں پہاڑوں کا مکیں ہُوں کوئی پتھر تو نہیں
تُو جو دُکھ دے تو نہ نکلیں مِرے آنسو کیسے

کچھ تو محتاط ہو اب اے مِرے بھولے شہ زور
کُھل چکا تجھ پہ کہ ٹوٹا ترا بازو کیسے

تُو نے کیا جال بچھائے نہیں قریہ قریہ
یہ اگر سچ ہے تو ہوگا رمِ آہو کیسے

اک تری یاد رہ گئی باقی
جو ترے بعد رہ گئی باقی

ڈھ گئے دھیان کے سبھی در و بام
صرف بنیاد رہ گئی باقی

سارا احوال کہہ دیا لیکن
ایک فریاد رہ گئی باقی

دل کے جانے کا جس میں تھا ذکور
وہی رُوداد رہ گئی باقی

ساتھ کیا کیا نبھایا لوگوں نے
تیری امداد رہ گئی باقی

ہو چکا ظلم، مٹ چکا ظالم
صبر کی داد رہ گئی باقی

خواہشِ وصل پوری ہونے میں
کتنی معیاد رہ گئی پڑی

بے سبب تو نہیں جہان میں ظلم
نسلِ شدّاد رہ گئی باقی

خوب ہے یہ غزل مگر کوئی
کسر اُستاد رہ گئی باقی

☆

اگر نہیں ہیں ہوا و ہوس قریب قریب
تو آ گزار لیں یک دو نفس قریب قریب

قفس میں گھر کا خیال اور گھر میں خوفِ قفس
بنا دیے گئے گھر اور قفس قریب قریب

جو کل کی بات ہے اس واقعہ کو بیت گئے
مِرے خیال میں سولہ برس قریب قریب

اگر یہ عشق بھی احسان ہے ترا مجھ پر
تو یہ بھی ہو گیا کارِ عبث قریب قریب

خیال ہے جو خدا کو خود اپنے بندوں کا
تو پھر یہ بات ہے مہمل، دعا کیے جائیں

وہ گل بدن کہ جو خود قابلِ پرستش ہیں
اُٹھا کے ہاتھ وہ کومل، دعا کیے جائیں

حیات بخش ہے خود جن کے آنچلوں کی ہوا
دراز کرکے وہ آنچل دعا کیے جائیں

وہ اپنے نین کے جادو سے کتنے غافل ہیں
کہ پھیلتا رہے کاجل، دُعا کیے جائیں

خدا کرے کہ اندھیرا نہ راستے میں رہے
بجھا کے آپ ہی مشعل دعا کیے جائیں

جنہیں خدا کی خبر ہو خدا سے مل دیکھیں
نہیں تو ملنے کی ہر پل دعا کیے جائیں

بنائیں آپ ہی مقتل جو اس نگر کو ظفرؔ
نہ یہ نگر بنے مقتل دعا کیے جائیں

دلوں میں وہ تو نہیں جو بیاں سے ظاہر ہے
یہ کون جانتا ہے ہم میں کون کافر ہے

لگا یہ روگ بھی آخر ترے ثنا خواں کو
زباں ہے منہ میں مگر بولنے سے قاصر ہے

ترے عذاب نے اُلجھا دیا ہے ذہنوں کو
وگرنہ کون تری رحمتوں کا منکر ہے

☆

اسی لیے تو اجل نے دیا ہے جینے مجھے
بہت قریب سے دیکھا ہے زندگی نے مجھے

زمیں پہ تیرنے لگتا ہُوں صورتِ گرداب
کبھی جو لگتے ہیں سات آسماں سفینے مجھے

اُمید اب ہے عبث مجھ سے نیک خوئی کی
بُرے عمل پہ تو ٹوکا نہ تھا کسی نے مجھے

وگرنہ عشق میں جاں سے گزر چکا ہوتا
ظفؔر، نباہ کے، آئے نہیں قرینے مجھے

قسمت میں اگر جدائیاں ہیں
پھر کیوں تری یادیں آئیاں ہیں

یاں جینے کی صورتیں ہیں جتنی
وہ صورتیں سب پرائیاں ہیں

فریاد کناں نہیں بس اک مَیں
چاروں ہی طرف دُہائیاں ہیں

ہر درجے پہ عشق کر کے دیکھا
ہر درجے میں بے وفائیاں ہیں

اِک تیرا بُرا کبھی نہ چاہا
گو ہم میں بہت بُرائیاں ہیں

تقریبِ وصالِ یار ہے کیا
کوچے میں ترے صفائیاں ہیں

اُس نے بھی نہ کوئی کسر چھوڑی
ہم نے بھی بہت سنائیاں ہیں

اب اور کہیں کا رُخ کریں آپ
اس جگ میں تو جگ ہنسائیاں ہیں

کیسے کریں بندگی ظفر واں
بندوں کی جہاں خدائیاں ہیں

☆

غزال دشت میں ہے اب، نہ جھیل میں ہے کنول
غزل سے دُور ہوا جارہا ہے رنگِ غزل

کئی خیال ہیں جن کی نہیں ہے کوئی حد
کئی سوال ہیں جن کا نہیں ہے کوئی حل

ہمارے دور میں پیدا نہیں ہوا افسوس
وہ آدمی کہ جہاں میں نہیں ہے جس کا بدل

سخن میں کاش ظفر ایسی تازگی آئے
کہ جیسے شاخ سے پھوٹے ہری بھری کونپل

وہ نقش گر جو دیا درمیاں بناتے ہیں
دیے کے چاروں طرف آندھیاں بناتے ہیں

کہیں ملیں تو مَیں پوچھوں کہ آپ کیا صاحب
اُجاڑنے کے لیے بستیاں بناتے ہیں

پُرانا لگنے لگا ہے جو یہ جہاں تو چلو
ہم اپنے عشق سے اپنا جہاں بناتے ہیں

ملے کہاں سے خبر آج کل تو اخبارات
خبر بناتے نہیں سرخیاں بناتے ہیں

حضور کس لیے زحمت اُٹھا رہے ہیں آپ
ہم اپنے آپ کو خود بے نشاں بناتے ہیں

نجانے آگ چلی جائے درمیاں سے کہاں
جو دل جلاتے ہیں اب وہ دھواں بناتے ہیں

میں دیکھتا ہوں خوشی سے اُچھلتے بچّوں کو
بنانے والے عجب تتلیاں بناتے ہیں

نہیں ملال ہمیں کوئی تم پہ مرنے کا
کہ ہم تو مر کے تمہیں جاوداں بناتے ہیں

نہ داد صرف ظفرؔ حسنِ ظاہری ہی کو دے
اُنہیں بھی دیکھ جو نقشِ نہاں بناتے ہیں

☆

اگر کبھی ترے بیمار خیریت لکھتے
ہمیں بتا کہ وہ خط کس کی معرفت لکھتے

اجازت اتنی تو دیتے ہمیں مسائلِ زیست
کسی کی موت پہ مضمونِ تعزیت لکھتے

یہ تُونے اچھا کیا خود لکھا تمام پیام
وگرنہ لوگ تو ہر بات من گھڑت لکھتے

ظفرؔ گلہ ہی نہ رہتا کوئی کسی کو اگر
ہمیں جو خود سے ہے، وہ بھی منافقت لکھتے

ہوائے کوچۂ دلبر خزاں پرور لگی ہم کو
بہار آئی مگر دل کی زمیں بنجر لگی ہم کو

ستم حد سے بڑھا اِتنا کہ اس بے اعتباری میں
وفا کی بات پتھر کی طرح آ کر لگی ہم کو

مقفل کر رہے ہیں دوسروں کی سجدہ گاہیں پھر
ترے لوگوں کی بستی بھی بڑی کافر لگی ہم کو

☆

وہی ہوا جو ہُوا میرے پہلے دوست کے ساتھ
وہیں رکا مَیں جہاں پیش رو مِرا ٹھہرا

دعائیں دیتے ہیں اُس کو بھی خشک ہونٹ مِرے
پیالہ چھین کے میرا جو پارسا ٹھہرا

ذرا مجالِ سخن دو کہ ہے یہ مان مجھے
سنی حکایتِ دل جس نے، ہم نوا ٹھہرا

بے وفا جا ترا خدا حافظ
جو ہُوا سو ہُوا خدا حافظ

ٹھیرنا مَیں تو چاہتا تھا وہاں
لیکن اُس نے کہا خدا حافظ

مجھے یکسر تباہ کرنے سے
جی اگر بھر گیا، خدا حافظ

تُو بھی رخصت ہُوا سفینے سے
اے مِرے ناخدا، خدا حافظ

تُو بھی کھویا ہوا ہے اور کہیں
مَیں بھی ہوں گم شدہ، خدا حافظ

کون جاتا ہے تیری محفل سے
جانا ٹھہرا مِرا، خدا حافظ

جاگنے سے تو بھاگ جاگے نہیں
میں تو اب سو چلا، خدا حافظ

ہجر تھا مسئلے کا حل، صابؔر
مسئلہ حل ہُوا، خدا حافظ

رات کو خواب ہو گئی، دن کو خیال ہو گئی
اپنے لیے تو زندگی، ایک سوال ہو گئی

☆

نکل کے دن سے ذرا دُور، رات سے باہر
خرام چاہیے کچھ، کائنات سے باہر

☆

عشق میں کوئی کہیں کوئی کہیں تک پہنچا
وہ مرا یار تو مجھ گوشہ نشیں تک پہنچا

☆

جب تک نہ قید شہر کے دیوار و در میں تھے
کچھ لوگ کتنے شاد خود اپنے کھنڈر میں تھے

☆

نئی غزل میں تغزل کہاں سے آئے گا
اُجڑ چکا ہے چمن، گُل کہاں سے آئے گا

☆

میری طرح ہر دکھ اور سکھ میں شاعری کرتے رہنا
اور چراغ کی فطرت کیا ہے، روشنی کرتے رہنا

کس کارن اِتنے رنگوں سے یاری، کس کارن یہ ڈھنگ
جتنے رنگ بھی چاہو زیست میں بھرلو، موت کا ایک ہی رنگ

نام و نمود سے اتنی دُوری ٹھیک ہے لیکن آخر کیوں
سارے جہاں سے قوسِ قزح کا رشتہ، اپنے آپ سے جنگ

پل میں دھجی دھجی بکھرنے والی، ایسی ہے یہ زیست
اک سے زیادہ بچّوں کے ہاتھوں میں، جیسے کٹی پتنگ

عمر بِتا دی اپنوں اور غیروں کے نقش بنانے میں
جب اپنی تصویر بنانا چاہی، پھیکے پڑ گئے رنگ

میں اِک لکھنے والا، مجھ کو بتانا، یار احمد پرویز
لوح و قلم سے آگے بھی ہے کیا یہ دنیا اتنی تنگ

(احمد پرویز کی یاد میں)

ایک ہی شخص کیوں ملا نہ ہمیں
کبھی کوئی ملا کبھی کوئی

کس میں ہمت، فنا کرے جو ہمیں
ہوگا اپنا ہی آدمی کوئی

زخم ہجر اور اس قدر تازہ
کیا یہاں تھا ابھی ابھی کوئی

ہم تمہارے نہ تم ہمارے ہوئے
رہ گئی عشق میں کمی کوئی

نہیں رہتا مَیں ہوش میں اکثر
کاش آئے کبھی کبھی کوئی

اور تو زندگی میں سب کچھ ہے
دل کشی بس نہیں رہی کوئی

عشق تو نام ہے تسلسل کا
حد نہیں اس کی آخری کوئی

عشق کا کھیل سب ہی کھیلتے ہیں
جیتتا ہے مگر کوئی کوئی

بات ہوتی تو کوئی بات بھی تھی
بات ہی تو نہیں ہوئی کوئی

☆

رُوبرو ہے اور نہیں ہے رابطہ
آئنے کو کیسے حیرانی نہ ہو

دل کا نذرانہ نہیں ہوتا قبول
دل اگر دینے میں نادانی نہ ہو

دل اگر دکھتا ہے دکھنے دو کہ پھر
کیا خبر اتنی بھی آسانی نہ ہو

کوئی عکس ہے کہ وہ آئنہ، کوئی خواب ہے کہ پری ہے وہ
ہوئے جس کو پا کے نہال تم، کہو کس کی جلوہ گری ہے وہ

طرب و ملال سے ماورا، کوئی معجزہ ہے جو دید کا
کہو کس کا حُسن ہے حکم راں، کہو کس کی خوش نظری ہے وہ

کوئی عشق روح میں رچ گیا، درِ یار تک جو پہنچ گیا
کہو کس نے لَو وہ لگائی ہے، کہو کس نے آگ بھری ہے وہ

میں پڑا ہوں راہ میں اس طرح، کوئی خاک دھول ہو جس طرح
مجھے آنکھ بھر کے جو تک لیا، کہو کس کی دیدہ وری ہے وہ

کوئی ہم سخن ہے نہ ہم سفر، کوئی باخبر ہی نہیں ظفرؔ
جو پیام آتے ہیں غیب سے، کہو کس کی نامہ بری ہے وہ

گھر میں رہیں تو سوچ کہ صحرا کو جایئے
صحرا میں آ کے فکر کہ گھر جانا چاہیے

مرنے کے غم میں زیست کے لمحے گزارنا
جینا اگر یہی ہے تو مر جانا چاہیے

اک راہ شہر کی ہے تو اک راہ دشت کی
صابرؔ مَیں سوچتا ہوں کدھر جانا چاہیے

☆

وہ نیند ادھوری تھی کیا، خواب ناتمام تھا کیا
میں جس کو سوچ رہا تھا خیالِ خام تھا کیا

اُدھر ہی سے کوئی گزرا جدھر سے گزرا تُو
تری مثال کوئی اور خوش خرام تھا کیا

ملوں تو کیسے ملوں بے طلب کسی سے مَیں
جسے ملوں وہ کہے مجھ سے کوئی کام تھا کیا

میں کسی بے وفا کا دوست نہیں
تجھ پہ اس کا مگر نہیں اطلاق

کیا مکمل کتابِ زیست رہے
روز اُکھڑتے ہیں کچھ نہ کچھ اوراق

کوئی فرہاد جان سکتا ہے
شررِ تیشہ کیا ہے کیا چقماق

اب ضرورت کسی دیے کی نہیں
یعنی روشن ہے اک کتاب سے طاق

اب تعلق یہ رہ گیا باقی
نہ وہ بیزار ہے نہ ہم مشتاق

کس لیے مر رہا ہوں بھوک سے مَیں
مجھ سے غافل ہے کیا مِرا رزّاق

سوچتا ہوں کہ دہر میں صابرؔ
کچھ نہیں اُس کے حُسن کے مصداق

قرار ہے مرے دل کو تمہارے ہونے سے
پناہ میں ہے یہ دریا کنارے ہونے سے

جو ہم نہیں تو ہمارے لیے کوئی بھی نہیں
کہ ہے وجود سبھی کا ہمارے ہونے سے

جو آنکھیں موند لوں شاید گنہ سے بچ جاؤں
بھٹک رہی ہیں نگاہیں نظارے ہونے سے

سہارے جب نہ میسّر ہوں لڑکھڑاتا ہوں
ہُوا ہے عیب یہ پیدا سہارے ہونے سے

فلک پہ صرف اندھیرا ہو اور چاند سا تُو
کہ بٹ رہی ہے توجہ ستارے ہونے سے

اگر ہے اتنا ہی احساس تو چلے آؤ
کہ بات بنتی نہیں صرف اشارے ہونے سے

ظفرؔ میں آپے سے باہر کہیں نہ ہو جاؤں
وصالِ یار میں وارے نیارے ہونے سے

جس طرح دھوپ میں ہو جاتا ہے سایا پیدا
ہو ہی جائے گا علاج اپنے دکھوں کا پیدا

جب بھی رکھّا ہے قدم میں نے کسی رستے پر
ایک رستے سے ہُوا دوسرا رستا پیدا

خاک ہو جاتا ہوں پہلے مَیں کسی کی خاطر
پھر اُسی خاک سے ہوتا ہوں دوبارہ پیدا

☆

ذرا سی دیر میں ہو جائیں آئنے کی طرح
کہاں تلک کوئی ان آنسوؤں میں رنگ بھرے

اُسے نہ ڈھونڈ کہ اب خواب ہو چکا ہے وہ شخص
جو تیرے ساتھ جیئے اور تیرے ساتھ مرے

بدل گئے ہو بہت تم کہ اتنی دیر سے مَیں
سمجھ رہا تھا کوئی اور ہے یہ تم ہو ارے

کسے سجدہ کِیا، خدا جانے
وہ تھا مَیں، یا خدا، خدا جانے

اپنے ساتھ اُس کو بھی مَیں بھول گیا
کیسا نشّہ چڑھا، خدا جانے

آپ اور ہم ہوا میں اُڑتے تھے
یہ ہے کیسی ہَوا، خدا جانے

میں نہیں پاسکا اُسے کسی طور
کون اُسے پاسکا، خدا جانے

ہجر کیا چیز ہے وصال ہے کیا
میں نہیں جانتا، خدا جانے

لوگ ملتے رہے ہیں آپس میں
کون کس کا ہُوا، خدا جانے

میں نے کیا کچھ نہیں کہا اُس سے
یاد اُسے کیا رہا، خدا جانے

اُس نے صابر کیا ہے جو بھی سلوک
جانوں مَیں یا مِرا خدا جانے

تری خاطر کہ جب برداشت ہی فرقت نہیں ہوتی
وہاں بھی جا پہنچتا ہوں جہاں عزت نہیں ہوتی

کسی کا حسن مجھ کو کھینچتا ہے چھوڑ دیتا ہے
تبھی مجھ سے کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں ہوتی

اگر بے طاقتی کے عارضے کی قید سے نکلوں
تو اُن کا ساتھ دوں، جن میں کوئی طاقت نہیں ہوتی

ترسنا بھی تڑپنا بھی سلگنا بھی الجھنا بھی
نہ جس کو عشق ہو، اُس کی تو یہ حالت نہیں ہوتی

ہزاروں خواہشیں کب ہیں فقط اپنی ہے اک خواہش
وہ خواہش کیا ہے بس اظہار کی ہمت نہیں ہوتی

بدلتا وقت ہم کو بھی بدل ڈالے یہ ممکن ہے
مگر اک یاد ہے دل میں کہ جو رخصت نہیں ہوتی

کہاں رحمت نہیں ہوتی کسے معلوم ہے پھر بھی
وہاں رکھا گیا ہم کو جہاں رحمت نہیں ہوتی

جیسے یہ بہار آخری ہو
ہر گل کو بکھرنے سے بچاؤں

تُو اِتنا عزیز ہے کہ تجھ کو
اب رسماً کیا گلے لگاؤں

☆

ہر ایک شخص تو دل میں جگہ نہیں دیتا
تُو ایسے آیا نہ کر ہر کسی کے رستے میں

خدا کی راہ میں کیوں آدمی بھٹکتا ہے
اگر نہیں ہے خدا آدمی کے رستے میں

☆

اسی لیے مَیں نڈر عشق میں ہمیشہ رہا
خطا سے پہلے سزا کی طرف نہیں دیکھا

یہی سبب نہ ظفؔر ہو کسی اُداسی کا
بہت دنوں سے خدا کی طرف نہیں دیکھا

Gud oye
Nice
Nice
Mara Hanif April 2007

یہ دنیا، ارے کہاں کی دنیا
ہے بھی تو فقط گماں کی دنیا

سب ظلم و ستم پہ چپ ہیں جیسے
ہو یہ کسی بے زباں کی دنیا

دُنیا کا خیال واہمہ ہے
یعنی ہے نہیں کی، ہاں کی دُنیا

خالی کوئی پالکی ہوئی ہے
اُجڑی کسی نوجواں کی دُنیا

دنیا کا مقام یہ نہیں ہے
ہے اور کہیں، یہاں کی دُنیا

صحرا سبھی پار کرکے دیکھے
صحرا نہیں ساربان کی دنیا

دنیا ہے یہ اس طرح ہماری
جیسے کسی بے نشاں کی دُنیا

ہم تم کو جو مل نہیں سکے ہیں
مجرم ہے یہ درمیاں کی دُنیا

دُنیا میں پڑاؤ اب کٹھن ہے
ہوگی کبھی رفتگاں کی دُنیا

میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں اُس کو
گُم ہے کسی مہرباں کی دُنیا

دُنیا میں ہماری آ سمائی
جانے یہ کہاں کہاں کی دنیا

آؤ وہاں چل کے دیکھتے ہیں
کیا یاں سے الگ ہے واں کی دُنیا

بے سُود کیا ہے اِس کا سودا
یہ تو ہے ظفرؔ زیاں کی دُنیا

☆

یہ غم ہے دیا ہُوا تمہارا
اب تم تو کرو نہ غمگساری

پنجرے سے نکال دو پرندہ
وہ بھول چکا ہے اب اُڈاری

جیون ہُوا دھنک رنگ ایسے، پیار چُنریا چننے سے
جیسے دانے پھول بنے ہوں جلتی ریت میں بھننے سے

تیری جن باتوں کے دکھ سے، سانس اُکھڑا ہے اتنی بار
اب تو شاید جی نہ سکوں مَیں، وہ باتیں پھر سننے سے

اور بھی پُرنم ہوں گی آنکھیں اور بھی گہرے ہوں گے دکھ
آنسو خشک نہیں ہو سکتے، خواب کی چادر بُننے سے

راکھ سمیٹ لے صبح سے پہلے، جلے ہوئے پروانے کی
اور تو کچھ حاصل نہیں ہوگا، شمع! ترے سر دھننے سے

پل میں دھوپ ہیں چھاؤں ہیں پل میں، حال عجب ہے ان کا ظفرؔ
کون ہیں کیا ہیں کُھلتے نہیں ہیں، صابرؔ صاحب گھنّے سے

گاڑی اِک وھیل سے نہیں چلتی
ساتھ اپنے گھسیٹ دوسرا وھیل

دیکھنے میں ہُوں جتنا رُوکھا مَیں
شاعری تو نہیں ہے اُتنی ثقیل

لہلہاتا نہیں ہے کھیت اگر
پور دابی ہوئی کماد کی پچھیل

سات رنگوں کے سینکڑوں کردار
یعنی قوسِ قزح ہے اِک تمثیل

اب تو ہے میرے یار کا قصبہ
یہ "ظفر وال" تھا کبھی تحصیل

تک رہا ہُوں مَیں سین ماضی کے
یعنی اب چل رہی ہے اُلٹی رِیل

مَن کے ساگر میں ڈوب دیکھوں گا
پہلے نینوں کی پار کرلُوں جھیل

ایک سائیں تھا کھو گیا وہ بھی
کوئی سنتا نہیں دُکھوں کی اپیل

روز جاتا ہوں اُس کی چوکھٹ پر
مکتبِ عشق میں نہیں تعطیل

ٹچ بٹن کی طرح جڑے ہوئے جسم
کیا بتائیں وصال کی تفصیل

درد ایسا اُٹھا وچھوڑے کا
ہوگیا جسم سارا نیل و نیل

کھاچکے ہیں شکست سب مہرے
اب تو کیجیے بساط ہی تبدیل

کاش وہ زندگی بھی دیکھتے تم
آنسوؤں میں جو ہوگئی تحلیل

میں ہُوں دوزخ میں اور پیاسا ہُوں
تُونے فردوس میں لگائی سبیل

میں محبت جسے سمجھتا رہا
وہ تو تھی محض میری اک تخئیل

میں بھی برباد اُس کے ساتھ ہُوا
ہے یہی میرے درد کی تاویل

بال کھُلتے ہوئے شانوں سے بکھرتی ہوئی شال
اور مَیں وصل کی لذت سے ہُوا مالا مال

سبھی چاہیں کہ بھرے زخم مگر مَیں چاہوں
تا قیامت رہے چاہت کا ہر اک زخم بحال

اُس کی فرقت ہے عجب اور غضب قُربت ہے
یعنی ملنا بھی محال اور بچھڑنا بھی محال

کون سی لہر میں اُتروں تو ملے کوئی گُہر
کون سے دشت میں بکھروں تو ملے کوئی غزال

چُپ رہا جائے تو ممکن ہے بھرم رہ جائے
حال ایسا ہے کہ پوچھو نہ ظفرؔ میرا حال

گئے دنوں کی نشانی مری غزل میں نہیں
جو کٹ گئی وہ جوانی مری غزل میں نہیں

زمانے بھر کے فسانے مِری غزل میں ہیں
بس ایک تیری کہانی مِری غزل میں نہیں

مجھے تو اشک فشانی ہی سے نہیں فرصت
سو کوئی زہر فشانی مِری غزل میں نہیں

چھُپا رکھی ہے غزل میں برہنگی اُس کی
اُسے گلہ ہے معانی مِری غزل میں نہیں

مُصر ہوں مَیں کہ ٹھہر، پیچ و خم خیال کے دیکھ
وہ معترض ہے روانی مِری غزل میں نہیں

اب آگے راستے جاتے نہیں اور کارواں گم ہیں
زمینیں وہ ہوئیں آغاز جن میں آسماں گم ہیں

نہ کوئی ہاتھ اُٹھتا ہے، نہ کوئی سر اُبھرتا ہے
بھنور میں تیرتے پھرتے ہیں تختے، کشتیاں گم ہیں

یہ منظر دیکھتے ہیں اپنے چوباروں سے ہم دونوں
گلی میں دھوپ ہے اب تک مگر پرچھائیاں گم ہیں

☆

امید انصاف کی رکھیں گے ہم اور وہ بھی تم کافر ادا سے
تمہارا اس طرح معصوم لوگوں سے مذاق اچھا نہیں ہے

ظفر زندہ ہیں جب تک، زندہ لوگوں کی طرح رہنا پڑے گا
یہ دنیا دارِ فانی ہے۔ ہمیشہ تو یہاں رہنا نہیں ہے

ہیں چاروں طرف محل سرائیں
یہ بوریا ہم کہاں بچھائیں

جلتا بھی نہ ہم کو دیکھ پائیں
خود آگ لگائیں خود بجھائیں

جیون کہیں اور جا بندھا ہے
کس کام کی اب تری وفائیں

شیشے کی طرح جسے بکھیرا
کیسے اُسے شکل ہم دکھائیں

بے روح وہ جسم ہو چکا ہے
اب راکھ سے آگ کیا جلائیں

یاد آ کے رلا رہا ہے کوئی
یہ اشک تھمیں تو مسکرائیں

خموش ہو گیا یوں کوئی بات کرتے ہوئے
ہَوا سے کچھ نہ کہے جیسے گل بکھرتے ہُوئے

میں زینہ زینہ جسے لے گیا بلندی پر
وہ میرے ساتھ نہ تھا سیڑھیاں اُترتے ہوئے

اکیلے پن کا سبب اور ہے کوئی لیکن
ترا خیال بھی آتا ہے آہ بھرتے ہوئے

وہ حُسن تھا کہ حیا تھی کہ پہلی بار اُس نے
چھُپا لیا تھا بدن، آئنے سے ڈرتے ہوئے

ہمارا عہدِ جوانی ہو یا تمہارا شباب
یہ شہ سوار تو لگتے نہیں ٹھہرتے ہوئے

کس قدر شفاف پانی تھا جسے گدلا کیا
اس کا باعث اک ہجومِ تشنگاں اور ایک مَیں

ایک کمرے میں سماتی ہی نہیں ہے زندگی
دیکھتی ہیں یہ تماشا کھڑکیاں اور ایک مَیں

☆

میں دوستی ہی نہیں دشمنی بھی کرتا ہوں
خیال رکھ کہ کوئی چال چل نہ جاؤں کہیں

خمارِ وصل اُترنے دیا نہ اس ڈر سے
میں تیرے وعدۂ فردا پہ ٹل نہ جاؤں کہیں

☆

یہ کس کا انتظار ہے یہ کیسی رات ہے
شمعیں تو بجھ گئیں مگر آنکھیں بجھی نہیں

دیکھو کوئی ستارہ ظفؔر آسمان پر
اُجڑے ہوئے مکاں میں اگر روشنی نہیں

جو سلیقہ وفا کا مجھ میں ہے
تُو نے دیکھا وہ کتنے فیصد میں

دم بخود زندگی بسر کر جاؤ
گونج کر کیا کرو گے گنبد میں

ہو بہو مجھ میں آ گئے وہ تمام
تھے جو عیب و ہُنر، اَب وجد میں

آپ کے بے شمار کھاتے ہیں
ڈال دیجے ہمیں کسی مد میں

اے خدا مجھ کو مصلحت سے بچا
لکھنا چاہوں مَیں رنگِ سرمد میں

کہاں بوسہ ہے میرے مولا کا
ڈھونڈتا ہوں مَیں سنگِ اسود میں

فالنامہ ہے زندگی بھی ظفرؔ
جی رہا ہوں حروفِ ابجد میں

تُو خواب میں بھی کبھی آیا نہیں، تُو خیال میں بھی کبھی آیا نہیں
ہم کہہ نہیں سکتے پھر بھی تجھے، تُو جیون کا سرمایا نہیں

تری دُوری کا اک روگ تو ہے، یہ روگ بھی اک سنجوگ تو ہے
کسی دُوری میں مجبوری میں، کبھی ہم نے تجھ کو بھلایا نہیں

تُو کھویا کس کی چاہ میں ہے، کیا جانے کس کی پناہ میں ہے
یہ سوچ کے نیند کے عالم میں، کبھی ہم نے تجھ کو بھلایا نہیں

ہم تجھ کو تلاش کریں کیسے، دن رات ہوں اپنے جب ایسے
کسی دن کی سنہری دھوپ نہیں، کسی رات کا گہرا سایا نہیں

نہیں آنا تھا تو نہیں آتے، شاید ہم تمہیں بھول ہی جاتے
مگر آئی تمہاری یاد ایسی ہمیں چین ابھی تک آیا نہیں

وقت سے پہلے کہیں، پیڑ نہ سب سوکھ جائیں
عقدہ نہ کھول اے خزاں، کس کا ثمر ختم ہے

لکھنا اگر ہے ضرور، ہم سے تو بہتر لکھو
ہم کو یہ دعویٰ نہیں، ہم پہ ہنر ختم ہے

☆

اتنا حصّہ تو ہمارا ہو تری سانسوں میں
دل کی صورت ترے سینے میں دھڑکتے جائیں

کون سا رُوپ ہے درکار محبت میں ظفرؔ
راکھ ہوجائیں کہ ہم لوگ دہکتے جائیں

☆

دھڑکتا ہے برابر دل سبھی کا
محبت میں کوئی مفلس نہیں ہے

اگرچہ کام کل وقتی ہے پھر بھی
ظفرؔ یہ شاعری سروس نہیں

نہ ترا خدا کوئی اور ہے، نہ مِرا خدا کوئی اور ہے
یہ جو قسمتیں ہیں جدا جدا، یہ معاملہ کوئی اور ہے

ترا جبر ہے مِرا صبر ہے، تری موت ہے مری زندگی
مِرے درجہ وار شہید ہیں، مری کربلا کوئی اور ہے

کئی لوگ تھے جو بچھڑ گئے، کئی نقش تھے جو بگڑ گئے
کئی شہر تھے جو اُجڑ گئے، ابھی ظلم کیا کوئی اور ہے

تمہی قاتلوں کے گواہ تھے، تمہی شاہ و میرو سپاہ تھے
مگر آج دیکھ لو وقت نے، کِیا فیصلہ کوئی اور ہے

نہ تھا جس کو خانۂ خاک یاد، ہُوا نذرِ آتش و ابروباد
کہ ہر ایک دن سے الگ ہے دن جو حساب کا، کوئی اور ہے

ہوئے خاک دھول تو پھر کھلا، یہی بامراد ہے قافلہ
وہ کہاں گئے جنہیں زعم تھا کہ رہِ وفا کوئی اور ہے

یہ ہے ربط اصل سے اصل کا، نہیں ختم سلسلہ وصل کا
جو گرا ہے شاخ سے گل کہیں تو وہیں کھلا کوئی اور ہے

وہ عجیب منظرِ آب تھا کہ وجود تھا نہ سراب تھا
کبھی یوں لگا نہیں کوئی اور، کبھی یوں لگا کوئی اور ہے

کوئی ہے تو سامنے لایئے، کوئی ہے تو شکل دکھایئے
ظفر آپ خود ہی بتایئے، مرے یار سا کوئی اور ہے

☆

اکیلا عکس نہیں آئنہ بھی اپنا ہے
وہ دوسرا ہے تو وہ دوسرا بھی اپنا ہے

وہ ایک نقش جو بے نقش کررہا ہے مجھے
مٹاؤں کیا کہ بنایا ہوا بھی اپنا ہے

☆

اس برہنہ زندگانی کے نقوش
کیا چھپاؤں اُس بُتِ بے باک سے

کیا سمیٹو گے کہ نکلے گی فقط
ایک بربادی مری املاک سے

بیٹھ کے دیکھ لیا پھولوں میں، کانٹوں پہ چل کے دیکھ لیا
دیکھنے والا کوئی نہیں ہے، حد سے نکل کے دیکھ لیا

عکس نہیں ہے سلامت کوئی، خواہش کے آئینے میں
یہ تو اور بھی ٹوٹ گیا ہے، دل نے مچل کے دیکھ لیا

قیمت کوئی نہیں جلنے کی، قدر نہیں کوئی بجھنے کی
ڈوب کے دیکھ لیا اشکوں میں، آگ میں جل کے دیکھ لیا

راتیں گزریں بے خوابی میں، دن بیتے بے تابی میں
جاگ کے دیکھ لیا راتوں کو، دن کو سنبھل کے دیکھ لیا

اِک دہلیز پہ دل رکھ دیتے، شاید مل جاتا وہ ظفرؔ
اور بھی دُور ہوئی ہے منزل، رستہ بدل کے دیکھ لیا

محبت انسان کو اتنا بے بس کر دیتی ہے
کہ خود پر اختیار ہی نہیں رہتا

بکھرتا پھول جیسے شاخ پر اچھا نہیں لگتا
محبت میں کوئی بھی عمر بھر اچھا نہیں لگتا

میں اُس کو سوچتا کیوں ہوں اگر ندرت نہیں اُس میں
میں اس کو دیکھتا کیوں ہوں اگر اچھا نہیں لگتا

وہ جس کی دلکشی میں غرق ہونا چاہتا ہوں مَیں
وہی منظر مجھے بارِ دگر اچھا نہیں لگتا

نکل کے جب مَیں ویرانے سے آبادی میں آیا ہُوں
رہوں بیگانۂ دیوار و در اچھا نہیں لگتا

وہ چاہے فصل پک جانے پہ سارے کھیت چُگ جائیں
پرندوں کو کروں بے بال و پر اچھا نہیں لگتا

وسیلہ راستے کا چھوڑ کر منزل نہیں ملتی
خدا اچھا لگے کیا جب بشر اچھا نہیں لگتا

زندگی تجھ کو سوا جانتے ہیں خواب سے ہم
اور واقف نہیں اس شہر کے آداب سے ہم

شہر آئے تو سمندر نے اُسے چھین لیا
عکس لائے تھے جو اِک گاؤں کے تالاب سے ہم

☆

دل تو مل جاتے ہیں راضی بہ رضا ہونے سے
تن بدلتے نہیں ملبوس نیا ہونے سے

میری بخشش کا یہ امکان کہاں سے نکلا
رہ گئی ہوگی ظفؔر کوئی خطا ہونے سے

☆

گزشتہ کی طرح آیندہ کا خیال بھی ہے
جواب ہی نہیں میرا سخن سوال بھی ہے

قریب آ کہ کھلے کون ہے عزیز مجھے
یہاں تو اصل بھی ہے اصل کی مثال بھی ہے

☆

عجیب لوگ ہیں زندہ نجانے کیسے ہیں
وہ جن کے پاس کمالِ ہنر نہیں کوئی

زیادہ تر ہیں وہی لوگ اب سفر میں ظفؔر
وہ جن کے پاس جوازِ سفر نہیں کوئی

خدا کا ذکر نہ کر ان اُداس لوگوں سے
یہ اہلِ دہر ہیں، رکھتے ہیں آس لوگوں سے

یہ تیرے ہاتھ بہت نرم بھی ہیں گرم بھی ہیں
انہیں ملایا نہ کر، بدحواس لوگوں سے

پرانے لوگ ہیں ہم، عیب ڈھانپنے والے
چُرا رہے ہیں نظر، بے لباس لوگوں سے

خدا کے ہوتے ہوئے، بے بسی کے عالم میں
کروں مَیں کیسے کوئی التماس لوگوں سے

زمیں سفر میں ہے اپنی جگہ ہے کون یہاں
سہارا مانگنا کیا، بے اساس لوگوں سے

ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں بجھتے رہتے ہیں
تو کیا اُمید، ستارہ شناس لوگوں سے

سدا رہے گا ظفؔر رشتۂ عوام الناس
اور اِک تعلق خاص، اپنے خاص لوگوں سے

تیرا خیال اور ظفر کو رہا نہ ہو
غافل تری طرف سے کبھی جو رہا نہ ہو

ٹکتے نہیں ہیں پاؤں مرے اس خیال سے
اُس در پہ انتظار مِرا ہو رہا نہ ہو

رُکتے نہیں ہیں اشک مرے اس ملال سے
وہ بھی تھا بے قرار، کہیں رو رہا نہ ہو

رکھنا تھا اُس کو میرا تو ہر حال میں خیال
کیا جانے یہ خیال ہی اُس کو رہا نہ ہو

خاموش ہر زبان ہے یوں ظلم پر ظفرؔ
بستی میں جیسے کوئی غزل گو رہا نہ ہو

ہم نے وطن کی آبرو، حفظِ سپاہ میں رکھی
پھر یہ وطن کی آبرو، نذرِ سپاہ ہو گئی

☆

جنہیں خراب کیا تھا اُنہی کے سامنے تھے
جوان اپنے وہ نوّے ہزار شرمندہ

☆

منصف پہ نہیں رہا بھروسا
قاتل پہ یقین کر رہا ہوں

☆

ایسا آمر نہیں ہُوا پیدا
روک لے جو عوام کا رستا

☆

میں جس دھرتی پہ مر رہا تھا
وہ بن گئی قتل گاہ میری

☆

فسادِ خلق کی تفصیل کیا سناؤں تجھے
کہ اُٹھ رہا تھا دھواں ہی دھواں، جہاں مَیں تھا

گریز پا ہے جو مجھ سے اُسی کے پاس بہت ہُوں
میں اپنے وعدے پہ قائم ہوں اور اُداس بہت ہوں

یہ قید وہ ہے کہ زنجیر بھی نظر نہیں آتی
یہ پیرہن ہے کچھ ایسا کہ بے لباس بہت ہُوں

مگر وجود کی ویرانیوں کا اور سبب ہے
اگرچہ نشے میں ہوں اور بدحواس بہت ہُوں

نہیں ہے کوئی بھی منزل، بھٹک رہا ہوں ابھی تک
کہ تیرے دل سے جو اترا ہوں بے اساس بہت ہُوں

خموش اس لیے رہتا ہُوں میرے سامنے تُو ہے
میں کم سخن سہی لیکن نظر شناس بہت ہُوں

کٹا ہے وقت فقط، زندگی نہیں کہ ظفر مَیں
طلب سے اور تغافل سے روشناس بہت ہُوں

Kia Baat Hay!

Nice

Nice

Nic

قدر اس واسطے کم کی شاید
مل گیا تھا وہ طلب سے پہلے

تجھے پانے کے اُٹھاتا ہُوں عذاب
تجھے کھونے کے تعب سے پہلے

قیس، لیلیٰ سے کہاں ملتا تھا
خاکِ صحرائے عرب سے پہلے

بے قراری ہے طبیعت میں عجب
جاؤں معبد میں کلب سے پہلے

عشق ہی وجہِ تعلق ہوگا
رشتۂ نام و نسب سے پہلے

کون سے رنگ میں شدت تھی ظفرؔ
اس کے چہرے پہ غضب سے پہلے

نگاہ کرنے میں لگتا ہے کیا زمانہ کوئی
پیمبری نہ سہی، دکھ پیمبرانہ کوئی

اِک آدھ بار تو جاں وارنی ہی پڑتی ہے
محبتیں ہوں تو بنتا نہیں بہانہ کوئی

میں تیرے دور میں زندہ ہوں تُو یہ جانتا ہے
ہدف تو مَیں تھا مگر بن گیا نشانہ کوئی

اب اس قدر بھی یہاں ظلم کو پناہ نہ دو
یہ گھر گرا ہی نہ دے دستِ غائبانہ کوئی

اُجالتا ہوں مَیں نعلینِ پائے لختِ جگر
کہ مدرسے کو چلا علم کا خزانہ کوئی

یہ سوچ کے راکھ ہو گیا ہوں
میں شام سے صبح تک جلا ہُوا

جس دل میں پناہ ڈھونڈتا تھا
اب اُس سے پناہ مانگتا ہوں

اک کاسۂ جسم ہوں مگر مَیں
اپنے ہی لہو سے بھر چکا ہوں

مجھ کو ہے تمیز جھوٹ سچ کی
سچ یہ ہے کہ جھوٹ بولتا ہوں

ہر شخص بچھڑ چکا ہے مجھ سے
کیا جانیے کس کو ڈھونڈتا ہُوں

مجھ کو تو نہ پڑھ سکے گا کوئی
میں کس لیے لکھ دیا گیا ہوں

مرتا ہُوں کہ مر مٹوں گا آخر
جینے کو تو عمر بھر جیا ہُوں

وہ جاگ رہا ہو شاید اب تک
یہ سوچ کے مَیں بھی جاگتا ہوں

ڈھل جاؤں گا اگلی بارشوں میں
دیوار پہ چاک سے لکھا ہُوں

تُو جب بھی ہوا ہے میرے حق میں
میں اپنے خلاف ہوگیا ہوں

ہے مجھ ہی سے زندگی عبارت
میں زیست کا تلخ تجربہ ہُوں

ناکام رہا ہوں ہر سفر میں
ہر راہ میں مثلِ نقشِ پا ہُوں

کیا سمجھے گا کوئی مجھ کو صاؔبر
میں ذات سے اپنی ماورا ہوں

☆

کئی باغ کب کے تھے سوچکے، جو نئی رُتوں نے جگادیے
یہ شہادتوں کی بہار ہے کہ جو اِتنے پھول کھلا دیے

کبھی فاصلوں کو سمیٹ کر، کبھی آنسوؤں کو سمیٹ کر
جو اُجڑ گئے وہ بسا دیے، جو بچھڑ گئے وہ ملا دیے

بے خبر ہوں کہ ستارے بھی سفیروں میں نہیں
میری قسمت مِرے ہاتھوں کی لکیروں میں نہیں

میں کسی تیر سے کس طرح بچا، حیراں ہوں
یا ہدف مَیں نہیں یا جان ہی تیروں میں نہیں

☆

ملا وہ رات مجھے محفلِ مسرّت میں
تو مَیں ادب سے نہیں، دکھ سے دُور جا بیٹھا

☆

آج اسے مَیں دیکھتا ہوں تو حیرت میں پڑ جاتا ہوں
کتنے زور سے اُس کے جسم کا دریا چڑھتے دیکھا تھا

☆

کچھ اور بڑھا گئی تجسّس
اک بات سمجھ میں آنے والی

☆

کافر تھے تمام لوگ پہلے
کیا تذکرہ شجرۂ نسب کا

☆

پھر اندھیرے میں زندگی اپنی
روشنی کی طرح نظر آئی

رستے بھر تصویر آنکھوں میں بام و در کی آتی رہی
گھر گلزار نہیں تھا پھر بھی، خوشبو گھر کی آتی رہی

اُس سے بچھڑ کے ایک اسی کا حال نہیں مَیں جان سکا
ویسے خبر تو ہر پل مجھ تک دنیا بھر کی آتی رہی

میں تو جتنے آیئنوں میں عکس وفا کا اتار سکا
ہر آیئنے میں دھندلاہٹ پس منظر کی آتی رہی

آس رہی بھیگی آنکھوں میں، وصل کنارے لگنے کی
من ساگر کے اندر جب تک، لہر اُدھر کی آتی رہی

چاہے وہ مانے کہ نہ مانے، دل کا دھڑکنا جھوٹ نہ تھا
اِتنی غفلت پر بھی اُس کو یاد ظفؔر کی آتی رہی

آئے ہو سوئے شہر تو بازار دیکھنا
بِکتے ہیں کیسے کیسے خریدار دیکھنا

اے شاخِ خوش نہال ترے گل ہیں سرفراز
تجھ سے بکھر نہ جائے یہ دستار دیکھنا

عالم ہے ایک، جس میں زمانہ اُداس ہے
لازم نہیں ہے وقت کی رفتار دیکھنا

ملبے تلے ہُوں اور ترستا ہوں دھوپ کو
چاہا تھا مَیں نے سایۂ دیوار دیکھنا

ہونٹوں سے ہم کلام پیالہ ہے زہر کا
اس گفتگو میں جان کا آزار دیکھنا

کبھی تجھے تو کبھی آسمان کو دیکھوں
چمک سی ہے ترے چہرے کی ہر ستارے میں

بہت کرم کیا مجھ پر کہ تم چلے آئے
ابھی مَیں سوچ رہا تھا تمہارے بارے میں

☆

یہ نور ظہور ہو رہے گا
آنکھوں کو تو بُجھنے سے بچاؤں

☆

میں ساتھ کیوں نہ گیا، عمر بھر رہے گا ملال
گیا جو وہ تو مرا چین ہی گیا سارا

☆

اِک نیند زندگی کی ہے اِک نیند موت کی
یہ کون سی ہے نیند، جگائے کوئی تجھے

☆

آؤ کسی اور سمت جائیں
شہرِ احباب سو رہا ہے

☆

عہدِ فراموش ہے، ہر کوئی خاموش ہے
آؤ کریں گفتگو، کوئی محل ہے اگر

☆

وہ جو حق پہ نہیں تھا اُس کو کون ظفر سمجھا
مرگِ سگانِ دنیا کیا ہے اور شہادت کیا ہے

کیا عمارت ہے محبت دو دلوں کے درمیاں
اور خواہش گفتگو کی سیڑھیوں کے درمیاں

کیا کہیں، جاتے ہوئے لمحوں کا ساتھی کون ہے
کوئی گرتا جارہا ہے بازوؤں کے درمیاں

جی رہے ہیں اپنے بچّوں کی جوانی دیکھ کر
بے حرارت دو بدن راتوں دنوں کے درمیان

عمر بھر کا ساتھ ہے اور گفتگو کوئی نہیں
ایک بت خاموش ہے صورت گروں کے درمیاں

آدمی پتھر نہ ہو تو ایک ہی صدمہ بہت
کیسے زندہ ہو ظفؔر اتنے دکھوں کے درمیاں

تجھ سے نسبت وصال کی سی ہے
یہ حقیقت خیال کی سی ہے

دیکھ ماضی کے اِس دھندلکے میں
کوئی پرچھائیں حال کی سی ہے

نہیں وصل اُس کا اس گھڑی بھی نصیب
یہ گھڑی بھی زوال کی سی ہے

کہہ تو دی قافیہ بدل کے غزل
پر خوشی کچھ ملال کی سی ہے

چل بسا کوئی ہم سفر شاید
اِک خبر انتقال کی سی ہے

ابھی صابر ظفر نہ جا کہ فضا
شہر میں اشتعال کی سی ہے

رہیں سفر میں کہ ٹھہریں کسی سرائے میں
کہاں ملو گے ہمیں، دھوپ میں کہ سائے میں

نجانے دہر بھی کیا چیز ہے کہ جچتے نہیں
ہم اُس کی رائے میں اور وہ ہماری رائے میں

اگر یہ ربط تماشا نہیں محبت ہے
تو کیا بتائیں اشارے میں اور کنائے میں

سُلگ رہے ہیں مسلسل کہ آتے جاتے نہیں
ہم اُس کے سائے میں اور وہ ہمارے سائے میں

بچھڑ رہے ہو ظفرؔ کس غرور میں آ کر
تم اپنے آپ میں ہو یا کسی پرائے میں

میں انتظار کروں گا اگر ترا سایا
بدل کے دھوپ میں آیا نہ دوسرا سایا

جو میرے واسطے برگد بھی تھا بہار بھی تھا
یہیں کہیں ہے مگر سر سے اُٹھ گیا سایا

ہم ایک جسم تھے اک روح تھے مگر پھر بھی
نہ لب بہ لب ہُوا سایا، نہ پابہ پا سایا

بہت سے لوگ ملے اُن میں ایک تُو بھی ملا
پھر اس ہجوم میں گم ہو گیا مِرا سایا

میں اپنے سائے کی خاطر جہاں کہیں بھی گیا
ہر اک جگہ پہ فقط تُو تھا یا ترا سایا

کوئی بو سے کا رنگ بھی ہو گا
جب وہ تصویرِ لب بنائی گئی

☆

وہی ہے اوّل و آخر تو پھر میں
کروں آغاز یہ قصہ کہاں سے

☆

خودکشی ہم نے خوشی سے کی ہے
لوگ کیوں سوگ منانے آئے

☆

ہر طرح کی لغزشوں کے باوصف
ہم کس کے لیے سنبھل رہے ہیں

☆

دُکھوں کی لہر ظفرؔ بستیوں میں دَر آئی
ہنسی مذاق کی باتیں بھی لوگ اب نہ کریں

☆

گئے لمحوں میں دعا کرنے چلا جاتا ہوں
میرے ماضی میں ہے مدفون محبت اُس کی

☆

سب کچھ لکھا ہوا ہے، سب کچھ پڑھا ہوا ہے
کیا جانیے ظفرؔ کیا، تحریر کر رہے ہیں

☆

وہ میرے ساتھ ہے میری ضرورتوں کی طرح
کسی فقیر کے پہلو میں جس طرح کاسہ

یہ اور بات ترے رُوبرو نہیں گزرا
میں جس عذاب سے گزرا ہُوں تُو نہیں گزرا

گزر رہا ہے کوئی اور اس خرابے سے
ہنوز قافلۂ رنگ و بُو نہیں گزرا

میں اُس بہار سے بھی نامراد لوٹ آیا
جہاں سے کوئی کبھی بے نمو نہیں گزرا

نہیں ہوں معرکہ آرا تو میرا دوش ہی کیا
کہ اس نواح سے میرا عدو نہیں گزرا

جما دیا مجھے یخ بستہ ساعتوں نے ظفؔر
گلے سے سانس، رگوں سے لہو نہیں گزرا

یہ پہلی پہلی لگن کا معاملہ ہے عجیب
کہ بیل اُس سے لپٹتی ہے جو شجر ہو قریب

یہ دل بھی طاق پہ رکھ دو بجھے دیے کی طرح
کسی بھی چیز کی گھر میں اگر نہیں ترتیب

مجال ہے کبھی حرمت پہ حرف آیا ہو
نجانے سیکھی تھی عشّاق نے کہاں تہذیب

تم اپنی آنکھوں میں اک پل مجھے اُترنے تو دو
میں ڈوب جاؤں کہ لگ جاؤں پار، میرا نصیب

ظفرؔ جو لوگ تھے شفاف آئنوں کی طرح
اُنھی کے بارے میں باتیں ہُوئیں عجیب و غریب

سیڑھیاں ہیں صرف گرنے کے لیے
اوج پر جانے کا زینہ اور ہے

☆

یہ قیدِ مہ و سال اگر یوں ہی رہی تو
پہنچے گا مرے حال کو تو کتنے برس میں

☆

نفرتیں مَیں نے یونہی دل میں بٹھا رکھی تھیں
اِس کا اندازہ مجھے اُس کی محبت سے ہُوا

☆

منا کے لے گئیں تنہائیاں مجھے واپس
میں ایک عمر کے بعد اپنے گھر سے نکلا تھا

☆

کسی کنول کی طرح خود ہی تیرنا سرِ آب
ہمارے ہاتھ نہ آنا ہمیں ڈبو دینا

☆

سدا جب ڈھب سے رہنا ہی نہ آیا
سدا کیا ایک سے حالات رہتے

☆

نمو پذیر ہے اے خاندانِ بے تاریخ
اک اور نام ترے شجرۂ نسب کے لیے

☆

ہم جہاں تک آئے ہیں رستہ بناتے آئے ہیں
ہم نہیں تو اور کوئی سوئے منزل جائے گا

روشنی سے ہُوا ظاہر کہ تُو ٹھہرا تھا کہاں کمرے میں
جگمگاتے ہیں ابھی تک ترے آنے کے نشاں کمرے میں

میں نے خالی نہیں رہنے دیا کمرے کو، ترے بعد کبھی
تُو نہیں تھا تو تری یاد کی دنیا تھی جواں کمرے میں

تُو چلا جاتا تو آ جاتی مجھے نیند بھی روتے روتے
اب تو سونے نہیں دیتا ترے ہونے کا گماں کمرے میں

ایک بڑھتا ہُوا اظہار ہی مقصود فقط وصل کا تھا
سانس روکے ہوئے دو جسم تھے، ٹھہرا تھا سماں کمرے میں

کبھی اُس نے بھی زباں کمرے سے باہر نہیں کھولی صابر
میرے دل میں بھی جو آیا وہ کِیا میں نے بیاں کمرے میں

میں اپنی بات کب کہہ سک رہا ہوں
ابھی لاوے کی صورت پک رہا ہوں

تمنا ہے ابھی کوئی نہ حسرت
ابھی حیرت سے تجھ کو تک رہا ہوں

یہ عشّاقی بھی کوئی چاکری تھی
سو میں تیرا سدا سیوک رہا ہوں

جو میری ستر پوشی کے لیے تھا
میں اُس پردے سے تجھ کو ڈھک رہا ہوں

نشہ اُترے تو جانے کیا کہوں میں
غنیمت ہے ابھی جو بک رہا ہوں

قریب اب آ رہی ہے میری منزل
نہ یہ سمجھو ظفرؔ میں تھک رہا ہوں

مجھ کو تو صرف اپنے کیے کا صلہ ملا
میں سوچتا ہوں تیری سفارش سے کیا ملا

تجھ سے بچھڑ کے مجھ پہ کچھ ایسے بُرے دن آئے
میں اپنی صف کو چھوڑ کے دشمن سے جا ملا

طے ہوگیا کہ غم سے کسی کو مفر نہیں
اُس کو بھی کب قرار تھا جس کو خدا ملا

اظہارِ عشق کیسے مَیں کرتا بھلا ظفؔر
وہ تو ہمیشہ خلقِ خدا میں گھرا ملا

یہاں تو دوسرا کوئی نہیں ہے
کوئی اپنے سوا کس کو پکارے

ترا کرم ہے کہ ہے روح تک رسائی مری
زمانہ صرف ترے خدّوخال تک پہنچا

خواب حقیقت بھی ہوتے ہیں، دیکھ تو لے کون آیا ہے
دل دروازہ کھولنے والا، دستک کم ہی دیتا ہے

جاؤں کارِ خیر کروں مَیں، لہو حرارت نذر کروں
سنتا ہُوں اک پھول بدن بے نشّہ ہے اور تنہا ہے

اِک دو پل پاتال سے پہلے، عشق، رفاقت ملنے پر
سائے تلے آجاتا ہے اور خواب میں چلتا رہتا ہے

ٹوٹ کے ہم آغوش ہوا تھا یار پھر اُس کے بچھڑنے میں
اتنی دیر لگی تھی جتنی دیر میں یہ دل دکھتا ہے

☆

جدھر جائیں مقام افسوس کا، حاصل سے ملتا ہے
بھٹکنے کے لیے بھی راستہ مشکل سے ملتا ہے

تماشا دیکھنے والو، ہمارا ڈوبنا دیکھو
بہت کم ظرف ہیں جن کا پتہ ساحل سے ملتا ہے

اگر ہے ہم سفر ہمراہ تو رنجِ سفر کیسا
یہاں تو گمرہی کا سلسلہ منزل سے ملتا ہے

ظفرؔ یہ بے بسی کیسی، چلو کوئی گنہ کرلو
یہاں تو ہر حقیقت کا نشاں باطل سے ملتا ہے

سفرِ شوق میں حائل ہوئے اغیار کہ دل
راستہ روک رہی ہے کوئی دیوار کہ دل

پیار کی پیاس بجھے آن پہ قربان ہو جاں
یعنی مطلوب تجھے سر ہے کہ دستار کہ دل

کس قدر فرق ہے اب سوچنے اور لکھنے میں
کون کہتا ہے بجا، شہر کا اخبار کہ دل

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے، غالبؔ کے بقول
دشت ہو گھر ہو کہ بازار کہ گلزار کہ دل

☆

خون سے لکھ دیا گیا، دل کا نصاب ریت پر
آج بھی ہے شگفتہ رُو، سرخ گلاب ریت پر

جیسے زمیں نہیں ہلی، جیسے ہَوا نہیں چلی
حرف بہ حرف نقش ہے، یوں وہ کتاب ریت پر

چاہو تو بندگی کرو، چاہو تو یوں ہی سو رہو
جائے نماز بچھ گئی، صورتِ آب ریت پر

آتش و آب اور ہَوا، کوئی نہیں ہے قرض خواہ
اُس نے چکا دیے ظفر، سارے حساب ریت پر

ایک سمندر سرگم کا تھا جس کا نہیں ہے ساحل کوئی
سُر کو سمیٹ کے رکھنے والا، ڈوبتا جاتا ہے دل کوئی

وہ جو بجھا ہوا رہتا تھا، وہ جو دکھا ہُوا رہتا تھا
اُس کے سخن کی لوَ ایسی تھی، جیسے چراغِ محفل کوئی

دل تھا دنیا کے خوابوں میں اور دھڑکن تھی مہتابوں میں
اپنی دُھن میں گُم رہتا تھا، دیکھنے میں تھا غافل کوئی

ساز سے سُر تک ایک سفر ہے، دھیان سے گیان کا ساتھ امر ہے
اپنی روح میں تان لگا کر، پالیتا تھا منزل کوئی

ایک غنائی دور ظفؔر اب ختم ہُوا خورشید انور پر
اُس کے سامنے راگ ایسے تھے، جیسے در پر سائل کوئی

(خواجہ خورشید انور کی یاد میں)

نئے کپڑے بدل اور بال بنا، ترے چاہنے والے اور بھی ہیں
کوئی چھوڑ گیا یہ شہر تو کیا، ترے چاہنے والے اور بھی ہیں

کئی پلکیں ہیں اور پیڑ کئی، محفوظ ہے ٹھنڈک جن کی ابھی
کہیں دُور نہ جا، مت خاک اُڑا، ترے چاہنے والے اور ہیں

کہتی ہے یہ شام کی نرم ہوا، پھر مہکے گی اس گھر کی فضا
نیا کمرہ سجا، نئی شمع جلا، ترے چاہنے والے اور بھی ہیں

کئی پھولوں جیسے لوگ بھی ہیں، انہی ایسے ویسے لوگوں میں
تُو غیروں کے مت ناز اُٹھا، ترے چاہنے والے اور بھی ہیں

بے چین ہے کیوں اے ناصؔر تُو، بے حال ہے کس کی خاطر تُو
پلکیں تو اُٹھا، چہرہ تو دکھا، ترے چاہنے والے اور بھی ہیں
(ناصر کاظمی کی یاد میں)

کس ناز سے وہ آیا تھا کِس ناز سے اُٹھا
یعنی اُٹھا جہاں سے تو اعزاز سے اُٹھا

بیساکھیاں اُٹھا کے نہ عالی ہُوا کبھی
جب بھی اُٹھا وہ اپنی ہی پرواز سے اُٹھا

حاصل نہیں تھا اُس کو خوشامد سے افتخار
وہ تو فقط ضمیر کی آواز سے اُٹھا

حلقہ بگوشِ مشفقِ خواجہ سرا نہ تھا
مردانہ وار خود ہی تگ و تاز سے اُٹھا

فرعونِ وقت کی نہ سند سے ہُوا فراز
اپنی ہی خُوش نوائی کے اعجاز سے اُٹھا

اعزاز ہے وہی کہ جو مولا عطا کرے
منہ پھیرتا وہ دہر کی اغراض سے اُٹھا

یہ خوئے جارحانہ کوئی عارضی نہ تھی
غیرت کا یہ خمیر تو آغاز سے اُٹھا

ڈوبا ہوا تھا گرمئ انفاس میں کلام
شعلہ سا کوئی آتشِ الفاظ سے اُٹھا

داد اُس کی شاعری کی اگر چاہیے مزید
مصرع کلامِ حافظِ شیراز سے اُٹھا

جانا تھا اُس کو یارِ وفادار کی طرف
دل تھامتا وہ دہرِ دغاباز سے اُٹھا

دل بر بھی دل فگار ہے دشمن بھی اشک بار
وہ بزمِ ناز سے عجب انداز سے اُٹھا

کیوں زندہ لوگ جیتے نہیں ہیں زیادہ دیر
پروردگار! پردہ تُو اس راز سے اُٹھا

درپیش تھا اُسے سفرِ آخرت ظفرؔ
دم لے چکا تو پہلوئے دم ساز سے اُٹھا
(عبیداللہ علیم کی یاد میں)

میں کیسے دل کو سنبھالوں کہ دل رہا گم ہے
اور اب کہاں اُسے ڈھونڈوں کہ ہر پتا گم ہے

نہ چاند چہرہ نہ اب وہ ستارہ آنکھیں ہیں
اور اُن کے عکس بھی گم ہیں کہ آئنہ گم ہے

سرائے اور بھی ویران ہوگئی دل کی
کہ اب سرائے کا جلتا ہوا دیا گُم ہے

رہِ وفا کا مسافر ہے میری آنکھوں میں
مگر مَیں دیکھ رہا ہوں رہِ وفا گم ہے

چراغ رکھ دیا مٹی میں آخرت کے لیے
اسی لیے تو مِرا شعلۂ نوا گُم ہے

حیا حیا سی وہ آنکھیں گھٹا گھٹا زلفیں
اور اُن کے ساتھ ہی چہرہ دُعا دُعا گُم ہے

میں دیکھتا ہوں کہ جائے نماز ہے خالی
ابھی ابھی جو عبادت گزار تھا گُم ہے

یہ اہلِ دہر اُسے دہر میں عبث ڈھونڈیں
خدا کی راہ میں جو بندۂ خدا گم ہے

خیال بھی گیا دم بھی گیا نوا بھی گئی
کہ ہم خیال کہ ہم دم کہ ہم نوا گُم ہے

ہوئے ہیں جمع یہاں سب تری محبت میں
وگرنہ ایک ڈھونڈو تو دوسرا گُم ہے

یہ تیرے یار تو ہوش و حواس کھو بیٹھے
ادھر سہیل، کرن اور اُدھر صبا گم ہے

یہ امتحاں کی گھڑی تھی سو اس گھڑی سے کھلا
کہ دوست کون سا حاضر ہے کون سا گم ہے

نہیں ہیں چاہنے والے اگرچہ کم میرے
مگر جو خاص طرف دار تھا مِرا، گُم ہے

میں چُپ نہیں ہوں، سمجھنا نہیں یہ، مَیں چُپ ہوں
کہ شورِ نوحہ گری میں مِری صدا گُم ہے

وہ بے حسی تھی کہ بے درد کٹ رہی تھی حیات
مِلا ہے درد تو اب درد آشنا گُم ہے

بجھا چکی ہے ہَوا، میرا ایک ایک چراغ
میں رہ گیا ہوں تو جانے کہاں ہَوا گُم ہے

(عبیداللہ علیم کی یاد میں)

کسی نے کب کہیں جینے کا اختیار دیا
تجھے اجل نے مجھے زندگی نے مار دیا

عجیب آنکھ مچولی یہ مرگ و زیست کی ہے
ابھی تو دل ترا جیتا ہی تھا کہ ہار دیا

کسی سے عشق کا اظہار جس میں کرنا تھا
خبر نہیں کہ وہ لمحہ کہاں گزار دیا

یہ آرزو تھی، مِری عمر بھی تجھے لگتی
مگر نہ تُونے، نہ قدرت نے اختیار دیا

☆

جانے والا ایسے گیا ہے جیسے تیر کمان سے
ہم کو اشارہ کر دیتا تو ہم بھی گزرتے جان سے

محفل ایک سجا لیتے ہم، یارانِ کم یاب کی
کوئی شناسا آ جاتا تو بن جاتے انجان سے

چُپ تھی بھلی کچھ کہنے سے تو چپ ہی رہتے عمر بھر
ہم محسوس اگر کر لیتے، تیرے کسی بیان سے

اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے، دنیا ہی ہم چھوڑ دیں
ہم کو بھی ہیں لاکھوں شکوے، اس بے درد جہان سے

خود ہی ظفرؔ دیوار اُٹھا لی، ہم نے اپنے اردگرد
تم بھی گئے پہچان سے پیارے، ہم بھی گئے پہچان سے
(شریف منور کی یاد میں)

☆

بجائے زندگی اب موت ہے کہانی میں
ڈبو دیا مِرے لوگوں کو اُس نے پانی میں

وہ نرم ہاتھ وہ آنکھیں وہ پھول سے چہرے
گھروندے جن کے بہے ریت کی روانی میں

تھیں کشتیاں بھی، کنارے بھی اور سہارے بھی
سو غرق ہو گیا سب کچھ غلط بیانی میں

بچا سکا نہ کبھی ڈوبتی رعایا کو
ہر آنے والا رہا مست حکمرانی میں

برائے پُرسشِ پسماندگانِ یار جو ہم
گئے تو ڈوب گئے غم کی بیکرانی میں

لب نہ ہلیں جب بولنا چاہوں، آہ بھروں تو ٹوٹے سانس کی ڈوری
اے مٹی کا بھاگ جگانے والے، کون سنائے تجھ کو لوری

تتلیاں آنگن آنگن پھریں اداس اور تیری کوئی خبر نہیں ہے
کس کی کھوج میں نکلا ہے تُو، کس نے تیرے کھلونے کر لیے چوری

تیرے کھیلنے والے ساتھی پوچھیں، دولہا سج کر کب آئے گا
کیسے بتاؤں کب پہنے گی نئے پٹولے تیری گڑیا گوری

تیری امانت تیرے حوالے کرنے کی ہے کچھ اتنی بے چینی
سینہ سینہ بھر کے رکھی ہوئی ہے چلو چلو دودھ کٹوری

اگر کبھی بل کھائے مٹی اور میں تجھ کو نئے جنم میں دیکھوں
تجھ کو دل سے لگاؤں اور سناؤں، چرخے کی گھوکر پر لوری

میں ایک ہاتھ تری موت سے ملا آیا
ترے سرہانے اگر بتّیاں جلا آیا

مہکتے باغ سا اِک خاندان اُجاڑ دیا
اجل کے ہاتھ میں کیا پھول کے سوا آیا

ترا خیال نہ آیا، سو تیری فرقت میں
مَیں رو چکا تو مرے دل کو صبر سا آیا

مثالِ کنجِ قفس کچھ جگہ تھی تیرے قریب
میں اپنے نام کی تختی وہاں لگا آیا

مکان اپنی جگہ سے ہٹا ہُوا تھا ظفرؔ
نجانے کون سا لمحہ گریز پا آیا

وہ مجھے چھوڑ گیا دکھ بھری حیرانی میں
خاک پر قتل ہوا اور ملا پانی میں

عکس پہلے تھا جہاں، اب ہے وہاں بہتا لہو
کیا چھپائے گا کوئی آئنہ، عریانی میں

ایک حالت بھی نہیں ایسی کہ جو غیر نہ ہو
چین مشکل میں ہے اب اور نہ آسانی میں

کیا کہیں، کیا ہوئے اسبابِ نشاطِ شب و روز
زندگی بیت گئی بے سروسامانی میں

زندہ رہنے کی ظفرؔ آئے نظر شکل کوئی
اصل کی ایک جھلک بھی ہو اگر ثانی میں

بے آہٹ چلی آتی ہے موت
اور واپس نہیں جاتی ہے موت

رونے بھی نہیں دیتی کسی کو
اور خود ہنستی گاتی ہے موت

آنکھوں کے در وا مت رکھنا
آنکھوں میں در آتی ہے موت

یہ ماں باپ کو کیا چھوڑے گی
بیٹوں کو کھا جاتی ہے موت

گھر سے نکلنے کب دیتی ہے
دروازے پر آتی ہے موت

کیسے ہوا وہ جدا، میں اسی حیرت میں ہوں
جتنی اذیت میں تھا، اتنی اذیت میں ہوں

آ گئی فرقت کی رات، اجڑی مری کائنات
کیسے ہو مجھ کو ثبات، میں کسی وحشت میں ہوں

اور تو سب محو ہیں، اپنے شب و روز میں
چین مجھے ہی نہیں، میں ہی مصیبت میں ہوں

آج میں کر آیا ہوں نورِ نظر کو وداع
آج اجل سے کہو، آئے مَیں فرصت میں ہوں

پاؤں گا اپنا ہدف، جاؤں گا اس کی طرف
ٹھہرا ہوا مَیں ابھی، شوقِ شہادت میں ہوں

کیسے کیسے لال بچھڑ گئے لوگوں کے
سارے ہی گھر بار اجڑ گئے لوگوں کے

گرتے پڑتے منزل تو کیا ملنا تھی
رستے ہی میں سانس اکھڑ گئے لوگوں کے

آئینہ ہی توڑ گیا آئینہ گر
سارے خدوخال بگڑ گئے لوگوں کے

حال. کیا وحشت نے ایسا جدائی میں
اچھے بھلے ملبوس ادھڑ گئے لوگوں کے

بچھڑا اپنا لال تو یہ احساس ہوا
کیسے کیسے لال بچھڑ گئے لوگوں کے

قریب آ گئی میرے جو ایک تیرتی لاش
وہ میری جان تھی، مَیں اس میں جا سماتا کاش

لہو لہان بدن کو گلے لگاتے ہوئے
نہ دیکھ پایا، کہاں زخم ہے، کہاں ہے خراش

میں دیکھتا ہوں اسے جان سے گزرتے ہوئے
خدارا، اے مرے منصف! کہانیاں نہ تراش

نہیں بچا مرے کاسے میں سانس کا سکہ
کہ ہوگئی ہے مری ساری زندگی، قلّاش

یہ اور بات کہ زندہ نہ آسکا وہ ظفر
جو آگیا مرے نزدیک، تھی اسی کی تلاش

کیا ہے پورا، اجل سے کیا ہُوا وعدہ
شکوہِ شام نے رخصت کیا ہے شہزادہ

جو اس میں ڈوبتے ہیں ڈوبتے ہی جاتے ہیں
اجل کے نشے سے بڑھ کر نہیں کوئی بادہ

☆

مارنے والوں نے شاید اُس کو اپنی موت سمجھا
زندگی کے واسطے اُس نے بلند آواز کی تھی

اِک عجب دُکھ سے ہوئی تھی زندگانی ختم اُس کی
اور جینے کی ادا بھی اِک نئے انداز کی تھی

روتا ہوں اور خود کو سمجھتا ہوں لاجواب
پیدا کیے ہیں تیری جدائی نے وہ سوال

چلتے ہیں اور لُوٹ کے گرتے ہیں خاک پر
بدلی نہیں ہے میرے ستاروں نے اپنی چال

نہیں ایسا کہ وقتِ مرگ للکارا گیا ہوگا
سنبھلنے سے بہت پہلے ہی وہ مارا گیا ہوگا

تعلق ٹوٹ جانا زندگانی سے، نہیں آساں
یقیناً جاں سے پہلے اُس کا دل ہارا گیا ہوگا

کوئی منّت کوئی فریاد کام آئی نہیں ہوگی
کوئی چارا نہیں ہوگا تو بے چارا گیا ہوگا

مجھے احساس ہے اس کا کہ اک دن سب کو جانا ہے
مگر کس حال میں جانے مرا پیارا گیا ہوگا

نہ آئی ہوگی نوبت ہی ظفؔر سورج نکلنے کی
لحد میں پہلے وہ یا صبح کا تارا گیا ہوگا

اب تو وصال محال ہے اپنا، بچھڑ گئے تو بچھڑ گئے
تم بھی سنبھال نہیں سکے خود کو، پاؤں مرے بھی اکھڑ گئے

بند کسی نے کرلیں آنکھیں اور میں تنہا دیکھتا ہوں
ساری طنابیں اکھڑ گئیں اور سارے خیمے اجڑ گئے

روز و شب مرے ساتھ جو تھا وہ روز و شب سے نکل گیا
اور ہمارے کام تھے جتنے، بنتے بنتے بگڑ گئے

ہم نے یونہی اظہار کیا تھا ہم کو رفو کی حاجت ہے
موت نے ایسا ٹانکا جوڑا، سارے ٹانکے ادھڑ گئے

قبر کی مٹی ہی اب اپنی عریانی کو ڈھانپے گی
زیست کے سارے پیراہن تو رفتہ رفتہ سکڑ گئے

کیا خبر تھی تُو گھر نہ آئے گا
اور پھر عمر بھر نہ آئے گا

کیا کبھی آئے گی نہ یاد مری
کیا کبھی لوٹ کر نہ آئے گا

کیا کہیں بھی نہ مل سکے گا تُو
کیا کہیں بھی نظر نہ آئے گا

میں تو یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا
تُو مری موت پر نہ آئے گا

یہ تری بھول ہے کہ تیری طرف
تیرا صابر ظفر نہ آئے گا

ہاں اتنا تو ربطِ جسم و جاں ہے
اک آخری سانس درمیاں ہے

ہر نقش ہے دل فریب لیکن
تصویر فریم میں کہاں ہے

سننا کبھی چاہو تم تو سن لو
فریاد کہ یہ مری زباں ہے

وہ حال ہوا کہ سوچتا ہوں
جینا ہو کہ مرنا، رائگاں ہے

ہونا ہی اگر نہیں ہے ہونا
پھر جو بھی نشاں ہے بے نشاں ہے

قفس کے بعد بھی قفس ہے دیکھ لو قفس کو توڑ کر
یہ قیدِ خانۂ حیات ہی سہی، نہ جاؤ چھوڑ کر

وہ اس طرح کبھی گیا نہ تھا وہ جس طرح چلا گیا
گیا تو کیا گیا وجود سارا رکھ دیا جھنجھوڑ کر

نہ جاؤ اہلِ دہر کی طرف، نہ جاؤ زہر کی طرف
تمام عمر اُس کو روکتا رہا مَیں ہاتھ جوڑ کر

ہرے بھرے درخت کو اُجاڑے جس طرح کوئی خزاں
اجل نے کر دیا ہے جسم کھوکھلا لہو نچوڑ کر

کہیں کہیں ظفرؔ اُسے کتابِ زندگی بھلی لگی
کہیں کہیں کوئی ورق رکھا ہُوا تھا موڑ کر

سفر نہ ختم ہُوا اور نڈھال ہو گئے ہم
اور اس سفر میں بہت پائمال ہو گئے ہم

ہمارا لختِ جگر قتل ہو گیا جیسے
مثال ہی نہ رہی بے مثال ہو گئے ہم

جو دیکھتا ہے ہمیں، لاجواب دیکھتا ہے
ہم ایسے کھو گئے، جیسے سوال ہو گئے ہم

اُتارنے کے لیے ہو گئے کوئی صدقہ
گزارنے کے لیے ماہ و سال ہو گئے ہم

اگر کمی تھی کوئی زندگی میں، غم کی تھی
وہ غم ملا کہ ظفرؔ مالا مال ہو گئے ہم

موت منزل تھی جو آغازِ سفر سے آگے
کاش تُو پاؤں نہ رکھتا کبھی گھر سے آگے

جو بھی جانا، نہیں جانا، یہی جانا آخر
کیا خبر بے خبری ہوگی خبر سے آگے

راستہ روک لیا روتی ہوئی آنکھوں نے
کچھ دکھائی نہ دیا دیدۂ تر سے آگے

لمحۂ ہجر کا انجام بھی ہے لمحۂ ہجر
پھر وہی شام و سحر، شام و سحر سے آگے

چلتے ہمراہ تو دکھ درد بٹاتے چلتے
کیا ملا تم کو بھلا جا کے ظفؔر سے آگے

ایک مَیں ہوں کہ لگ گئی مجھے چُپ
چُپ ہُوا یُوں کہ لگ گئی مجھے چُپ

سب مضامینِ مرگ کا حاصل
ایک مضموں کہ لگ گئی مجھے چُپ

چھا گیا میری زندگانی پر
کوئی افسوں کہ لگ گئی مجھے چُپ

دیکھ آ کر کہ اس قدر مرا حال
ہے دگرگوں کہ لگ گئی مجھے چُپ

موت سے ہم کلام لختِ جگر
ایک مَیں ہوں کہ لگ گئی مجھے چُپ

ہَوا میں خاک سہی، خاک میں ہوا تو نہیں
دیا جو خاک میں رکھّا ہے وہ بجھا تو نہیں

رہو گے کیا یونہی حیرت سرائے خاک میں چُپ
میں سن رہا ہوں کہو تم نے کچھ کہا تو نہیں

میں دیکھتا ہوں گزرتے ہوئے مسافر کو
مسافروں کا اگرچہ یہ راستا تو نہیں

کوئی مرے کہ جیے، شاعری کیے جاؤں
یہ شاعری کہیں میرے لیے سزا تو نہیں

جس طرح ہے چوکھٹے میں قبر کے لختِ جگر پوری طرح
میں بھی کب کا مَر رہا ہوں مَر نہیں پایا مگر پُوری طرح

رینگتے پھرتے ہیں سایوں کی طرح جو لوگ ابھی، آ اُن سے مِل
موت سے بولے کوئی جا کر کہ ہر رگ میں اُتر پُوری طرح

ذرّہ ذرّہ ریت کی صورت بکھرنا کس نے دیکھا ہے یہاں
دیکھنے والے تماشا دیکھ لیں تیرا، بکھر پُوری طرح

کچھ نہیں کہتے مجھے طاہر نظامی اور اسلم راجپوت
کوئی کہتا ہے کہ جی اور کوئی کہتا ہے کہ مَر پُوری طرح

اہلِ خانہ کچھ سلامت ہیں ابھی تک اور اِک صابر ظفر
اے اجل آ، ہو نہیں پایا ابھی برباد گھر پُوری طرح

اگر روزِ اجل کوئی نہیں ہے
تو کیوں جینے کا پل کوئی نہیں ہے

ہم اہلِ غم کی ہستی میں بجز مرگ
کسی اُلجھن کا حل کوئی نہیں ہے

ہیں اشکوں سے بھری آنکھوں کی جھیلیں
مگر ان میں کنول کوئی نہیں ہے

بچھڑتی جارہی ہے زندگانی
اگرچہ بے عمل کوئی نہیں ہے

میں اپنے روگ لکھتا جارہا ہوں
مرا رنگِ غزل کوئی نہیں ہے

اُسی کو موت نے چھینا ظفرؔ سے ** very nice
کہیں جس کا بدل کوئی نہیں ہے

جلا ڈالو اگر اندوختہ اپنا تو مرنے میں سہولت ہو
یہاں سے تو چلو کیا جانے آگے منتظر گم گشتہ جنّت ہو

زمیں رہنے نہیں دیتے مرے پیروں تلے اور آسماں سر پر
قیامت آنے والی ہے مگر میرے لیے تو تم قیامت ہو

مسلسل ایک منظر کی مہورت سے کہاں تک جی بہل پائے
جسے دیکھا نہ ہو پہلے کبھی، ایسی کوئی نادیدہ صورت ہو

تمہاری سمت لے جائے مجھے بیگانہ کر کے ساری دنیا سے
کسی آوارگی کے ختم ہونے سے بہت پہلے جو وحشت ہو

جسے مرنے نہیں دیتے ہو اپنی زیست کے انجام سے پہلے
ضروری تو نہیں صابر ظفر اُس شخص کو تم سے محبت ہو

ہر خواب میں اک خلا رہے گا
یہ غم تو مجھے سدا رہے گا

تجھ سے مری زندگی سلامت
مجھ میں ترے بعد کیا رہے گا

رہتا نہیں پاس تُو مرے تو
جا ساتھ ترے خدا رہے گا

جینے کا جو راستہ نہیں ہے
مرنے کا تو راستہ رہے گا

یہ تیری جدائی کا ثمر ہے
یہ دل جو ظفرؔ دکھا رہے گا

مرتا ہے جب کہیں کوئی، مرتے ہیں صبح و شام
اُس کی بلا سے، کیسے گزرتے ہیں صبح و شام

کیا، کچھ سمیٹتے ہیں کسی کے وجود کو
یا صبح و شام ہی میں بکھرتے ہیں صبح و شام

ہوتے نہیں کسی کے مقدر میں جو ظفؔر
جانے وہ کس لحد میں اترتے ہیں صبح و شام

☆

یہ ہم جو زندہ ہیں دراصل مر چکے ہیں ہم
اس ایک دُکھ سے جنم لے گی اب نئی تہذیب

وگرنہ دل سا کوئی اور بادشاہ نہ تھا
اسے تو اُس کی جدائی نے کر دیا ہے غریب

ظفؔر اب اپنی جگہ پر کوئی بھی چیز نہیں
کہ اُس کے جاتے ہی سب کچھ ہوا ہے بے ترتیب

وہ تو نہیں رہا مگر، اُس کا خیال رہ گیا
ساتھ مَیں کیوں نہ ہو لیا، بس یہ ملال رہ گیا

کیا مَیں بتاؤں رہ گیا، کیا مرے پاس اُس کے بعد
آنکھ میں اشک رہ گئے، لب پہ سوال رہ گیا

دل کے تمام کاروبار، جاتے ہی اُس کے رُک گئے
یعنی مرے نصیب میں، صرف ملال رہ گیا

وہ تھا تو اُس کے ساتھ ساتھ، رقص میں تھی یہ کائنات
میں ہوں کہ میرے ساتھ ساتھ، جاں کا وبال رہ گیا

ختم نہیں ہوا سفر، وہ بھی نہیں ملا مگر
اُس کی تلاش میں ظفؔر، ہو کے نڈھال رہ گیا

سنتا ہوں تیری شہنائی بسم اللہ خان
دیکھ مگر میری تنہائی بسم اللہ خان

اِتنی کم عمری میں سُر کیا پکّا لگتا
اس کمسن نے عمر جو پائی بسم اللہ خان

سازِ نفس کیا ٹوٹا، لے نہ رہی کوئی باقی
کوئی ریاضت کام نہ آئی بسم اللہ خان

موت کا راگ جو پروائی نے چھیڑا ہے وہ سُن
میں روتا ہوں یا پُروائی بسم اللہ خان

دیکھ بچھڑ گیا کیسے، جانِ جگر ظفؔر کا
شہنائی کیوں دے نہ دہائی بسم اللہ خان

بکھر کے تم نے مری زندگی ہی بکھرا دی
سزا مجھے مری برداشت سے زیادہ دی

میں اور ہو گیا اب تیری دید سے محروم
ان آنسوؤں نے تری شکل اور دھندلا دی

پلٹ کے آنے کا تم نے تو نام ہی نہ لیا
ذرا سی مَیں نے تمہیں مہلتِ سفر کیا دی

رہا سہا جو خسِ قرب تھا وہ راکھ ہوا
اجل نے ایسی جدائی کی آگ بھڑکا دی

جو تُو نہیں ہے تو یہ زندگی سزا ہی تو ہے
خدا نے کیوں مجھے زنجیرِ زیست پہنا دی

دیکھو یہ جواب کا سلیقہ
وہ سُن کے مِرا سوال چُپ ہے

☆

خود موت بھی ہاتھ مَل رہی تھی
کس کرب میں زیست کل رہی تھی

☆

سایا کوئی مِل رہا تھا مجھ سے
آندھی بڑی تیز چل رہی تھی

☆

کچھ گنہ کم کر تولوں، پر، نامۂ اعمال سے
آنکھ ہٹتی ہی نہیں ہے کاتبِ تقدیر کی

☆

روح تیری دسترس میں ہے تو کیا تُو نے کیا
میں نے تو پھر بھی عمارت جسم کی تعمیر کی

وہاں نہیں رہا مَیں، ہونا چاہیے تھا جہاں
وہاں مَیں رو نہ سکا رونا چاہیے تھا جہاں

ابد نے بند کیے ایسے، راستے سارے
وہاں نہ کھویا، جسے کھونا چاہیے تھا جہاں

مری بجائے وہاں اور سو رہا ہے کوئی
ملی نہیں وہ لحد، سونا چاہیے تھا جہاں

وہ جس کی لے پہ کوئی اپنے سُر میں بول اُٹھتا
نہ بویا، گیت کوئی بونا چاہیے تھا جہاں

وہاں پڑا ہے زمیں اوڑھ کر ظفرؔ، کوئی اور
زمیں کا بوجھ مجھے ڈھونا چاہیے تھا جہاں

آئے گی جب زندگی، آ نہ سکے گی اجل
اور پلٹ آئے گا، بیتا ہوا کوئی پل

دیدہ و دل منتظر، آئے گا خود کوئی پھر
جینا ہے اب کس طرح، آ کے نکالے گا حل

کھینچے کسی کی لگن، روکے کسی کی تھکن
کوئی کہے ساتھ رُک، کوئی کہے ساتھ چل

کرتا نہ ماتم کوئی، کرتا نہ پھر غم کوئی
ہوتا کسی کا اگر، کوئی جہاں میں بدل

جا کے کروں کیا کہیں، چین کہیں بھی نہیں
مرنا ہے آخر یہیں، دل سے کہوں مَیں سنبھل

پھر ہوگئی ہے ظلم کی حد یارِ من مدد
کرنا ہے ایک وار کو رد یارِ من مدد

اے ربِ ذوالجلال مَیں تنہا ہوں کیا کروں۔
سب جا چکے مرے اَب وجَد یارِ من مدد

بولے یہ بے بسی کہ مرے بس میں کچھ تو ہو
بے طاقتی پکارے، مدد یارِ من مدد

لختِ جگر کو لگ گئی اغیار کی نظر
کام آ گیا ہے اُن کا حسد یارِ من مدد

کافی ہوں مَیں جہاں کے جہنم میں جلنے کو
جنّت نشاں ہو اُس کی لحد یارِ من مدد

خون کا بدلہ خون ہے لیکن ظالم کا ہے خون سفید
جن لمحوں میں خون ہوا ہے اُن لمحوں کی راکھ کرید

وقت کی چھلنی سے گرتا ہے، لمحہ لمحہ قربت کا
ہجر کے غم میں گھلنا لیکن کیا چھلنی کے گننا چھید

☆

وہ دو قدم ہی چلا اور گزر گیا جاں سے
اجل کو ڈھونڈ لیا اُس نے، راہ کھوئے بغیر

گزر گئے کئی دن رات جلتے بجھتے ہوئے
گزر گئے کئی دن رات جاگے سوئے بغیر

کسی بھی شمع کو آتا نہیں قرار ظفرؔ
لرزتی لَو میں پتنگے کی جاں پروئے بغیر

☆

آخری ہچکی میں کرلی بات خود اپنی
اور ہمیں بے زبان چھوڑ گیا ہے

موت کی آخری ہچکی کو ذرا غور سے سن
ساری عمر کا خلاصہ اسی آواز میں ہے

موت نے دیکھ لیا گھر میرا
آگے کیا ہو، یہ مقدر میرا

ایک منظر کی طرح ہوں لیکن
ایک رہتا نہیں منظر میرا

ایک بستر ہوا خالی دیکھو
اور برابر میں ہے بستر میرا

تم تو آتے ہی نہیں کیا کیجے
حال دیکھو کبھی آ کر میرا

کوئی حالت ہے ظفرؔ یہ حالت
دل نہیں لگتا ہے یکسر میرا

چلو تو ساتھ چلو ورنہ ہم گئے تو گئے
کہ ایک بار جو سوئے عدم گئے تو گئے

جو سانس کھینچتے ہیں کوئی دم کے مہماں ہیں
کہ اب رکیں گے نہیں کوئی دم گئے تو گئے

خدا کا ملنا نہ ملنا خدا کی مرضی ہے
مگر ہمیں ہے یہ دھڑکا صنم گئے تو گئے

یہی دلوں کا اثاثہ ہیں وقتِ رخصتِ یار
انہیں قریب ہی رکھو، یہ غم گئے تو گئے

یہی ہے عشق کہ بے خوفِ مرگ وزیست غزال
تمہاری سمت بصد رقص و رم گئے تو گئے

یہ مہلتِ زیست کیا ملی ہے
ہر سانس کی اک سزا ملی ہے

وہ ساتھ مرے ابھی ابھی تھا
تنہائی اچانک آ ملی ہے

بھڑکے نہیں بے سبب یہ شعلے
شعلوں کو بہت ہوا ملی ہے

آساں تو نہ تھا چمکنا اپنا
جلنے سے ہمیں جِلا ملی ہے

یا کوئی ملا نہیں مسیحا
یا زہر بھری دوا ملی ہے

سمجھے جسے راہِ زندگی ہم
وہ راہِ اجل سے جا ملی ہے

وہ چھاؤں ظفر ملی نہ ہم کو
یہ دھوپ تو جا بجا ملی ہے

خموشیوں کی خاک میں دلوں کو رولتے یہ زندگی گزر گئی
غبار کی طرح زباں سے کچھ نہ بولتے یہ زندگی گزر گئی

ہم اپنے اپنے گھر میں قید تھے تو ہم پہ بند تھیں تمام کھڑکیاں
اور اس سے پیشتر کہ کھڑکیوں کو کھولتے یہ زندگی گزر گئی

وہ زندگی سے دور ہو گیا تو ہم بھی زندگی سے دُور ہو گئے
پھر اپنے جسم و جاں میں کوئی زہر گھولتے یہ زندگی گزر گئی

کبھی لگا کہ سانس کی گرہ میں زندگی ہے اور کبھی لگا نہیں
اسی طرح متاعِ زندگی ٹٹولتے یہ زندگی گزر گئی

اگرچہ منزلیں ہماری منتظر تو ہوں گی آج بھی مگر ظفؔر
کہاں کی منزلیں کہ راستوں میں ڈولتے یہ زندگی گزر گئی

خیالوں میں یہ کس کی دستکیں ہیں
اگر بیرونِ در کوئی نہیں ہے

میں کیوں اب گھر کی تختی پر نہ لکھ دوں
یہاں صابر ظفرؔ کوئی نہیں ہے

شاعری کو، نسلوں، عمروں اور جدید و قدیم کے حصوں میں بانٹنا کچھ عجیب سی رسم بن گئی ہے یہ تو ایک مسلسل ریاضت کا کام ہے جسے کرتے ہوئے شاعر کو وقت، عمر، جدید اور قدیم کا کچھ ہوش نہیں رہتا۔

صابر ظفر کا کلام پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ہم عصر اسلوبِ شعر اور اسلوبِ تنقید کے اثر سے آزاد اور بے نیاز ہو کر کارِ شاعری کو ایک مبتلا آدمی کی طرح کئے جا رہا ہے اس کی شاعری میں کئی رنگ ہیں جو خواہشِ تکمیل میں ہیں، ایک حق ناشناس اور غیر غمگسار معاشرے میں تنہائی کا رنگ ہے جو اس کے بیان میں ہے ایک آدرش کے ہجر کا رنگ ہے جو مسلسل اس کے اشعار کو رنگین کرتا رہتا ہے، ایک ہجرتِ دائم کا رنگ ہے جس میں کچھ کھو دینے کا افسوس اور کچھ پا لینے کی امید کے رنگ شریک ہیں یہ رنگ مختلف اشکال میں ایک دوسرے کو مدد دیتے ہوئے، رفاقت کرتے ہوئے یا ایک دو لائی کیفیت میں سفر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

خزاں کی رُت ہے جنم دن ہے اور دُھواں اور پھول
ہوا بکھیر گئی موم بتّیاں اور پھول

منیر نیازی